جلد ۹ - اگست ۱۹۵۳ء عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرستِ مضامین

جلد (۷۹)	اگست ۱۹۷۳ء مطابق رجب ۱۳۹۳ھ	عدد (۶)

ماہنامہ ترجمان القرآن

۵-اے ذیلدار پارک - اچھرہ لاہور

زرِ سالانہ : دس روپیہ —— فی پرچہ : ایک روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا - پرنٹر :- محمد شفیع

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

چند روز ہوئے ملک کے ایک مشہور صحافی ۔۔ جنہیں جماعت اسلامی کے ہمدرد نقادوں کے زمرہ میں شامل کیا جاسکتا ہے ۔۔ سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے علیک سلیک کے بعد ذرا دل گیر ہو کر یہ سوال کیا کہ کیا جماعت اسلامی کی ترقی کی رفتار تشویشناک حد تک گر تو نہیں گئی ؟ میں نے ان سے عرض کیا کہ میرا یہ مرتبہ مقام نہیں کہ کسی اخبار نویس کو جماعت کے بارے میں کوئی بیان دے سکوں البتہ آپ اگر جماعت کے ایک ادنیٰ کارکن سے اپنی ذاتی حیثیت میں تاثرات معلوم کرنا چاہتے ہیں تو پھر میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ خدا کے فضل سے جماعت کی رفتارِ کار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے بلکہ کچھ اضافہ ہی ہوا ہے۔ میری یہ بات سن کر وہ کچھ خاموش سے ہو گئے مگر ان کے چہرے کے آثار بتا رہے تھے کہ وہ میری اس گزارش کو یکے از وابستگانِ جماعت اسلامی کی محض خوش فہمی خیال کر رہے ہیں۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد انہوں نے کہا: ممکن ہے ایسا ہی ہو مگر جماعت کے کاموں میں وہ گہما گہمی نظر نہیں آتی جو اس وقت ہونی چاہیئے ۔ مجھے اگرچہ ان کے اس مشاہدے سے بھی اتفاق نہ تھا مگر میں نے ان کی اس رائے کی تردید مناسب نہ سمجھی البتہ جماعت کی رفتارِ کار کا صحیح صحیح جائزہ لینے کے لیے بعض دوسرے پہلوؤں کی طرف اُن کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں میں نے ان کی خدمت میں یہ گزارش کی: آپ ایک قافلے کو دریا عبور کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو آپ اُس کی رفتار کا ایک اندازہ لگا لیتے ہیں لیکن ایک حصہ عبور کر لینے کے بعد قافلہ ایک ایسے مقام پہ آجاتا ہے جہاں دریا کا بہاؤ بڑا خوفناک، اس کی لہریں بڑی تند و تیز اور گرداب بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دریا کی تہہ میں اول تو کوئی ایسی زمین نہیں ملتی جہاں آسانی سے قدم جمائے جاسکیں اور اگر کہیں ملتی بھی ہے تو وہ دلدل ہوتی ہے جس میں ہر لمحہ پاؤں دھنستے چلے جاتے ہیں۔ ان نامساعد حالات میں اگر کوئی دریا عبور کرنے والا قافلہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ بہنے کے بجائے اس کی تند و تیز

موجوں کی نذر ہونے کے بجائے اور گرداب میں گرفتار ہونے کے بجائے اپنی جگہ پر ڈٹا رہتا ہے تو میرے نزدیک یہ اس کی رفتار میں کمی کی علامت نہیں بلکہ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس قافلہ میں اتنی ہمت، جرأت اور قوت موجود ہے کہ بپھرے ہوئے دریا کی کف بدہن موجوں کا مقابلہ کر کے اپنے قدم آگے بڑھا سکے۔ انسانیت کے جو قافلے ان صفات سے متصف نہیں ہوتے سیلابِ زمانہ کی خوفناک موجیں انہیں خس و خاشاک کی طرح اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہیں اور ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔

کسی با اصول جماعت یا انقلابی تحریک کی رفتارِ کار کو جانچنے کے لیے صرف یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اُس نے ملک کی سیاسی سطح پر کتنے حباب اٹھائے ہیں اور کس نوعیت کا تموج برپا کیا ہے بلکہ اس امر کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ اس جماعت یا تحریک نے معاشرے کے موثر طبقات کے فکر و نگاہ کے زاویوں کو کہاں تک بدلا ہے اور انہیں عمل کی کونسی نئی راہوں پر گامزن کیا ہے۔ با اصول جماعتیں اور انقلابی تحریکیں سرکش گھوڑوں کی طرح آگے نہیں بڑھتی جاتیں بلکہ شمعِ علم و عرفان کی طرح لوگوں کے قلب و دماغ کو ایک خاص انداز سے روشن کرتی ہیں۔ علم انسان کے اندر ایک رفتار اور ایک ہی نہج سے سرائت نہیں کرتا بلکہ مختلف منزلوں پر اس کی رفتار اور نہج میں برابر تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس کی سب سے پہلی منزل یہ ہوتی ہے کہ انسان کے اندر یہ احساس بیدار ہو جائے کہ وہ علم سے عاری ہونے کی وجہ سے ایک عظیم دولت سے محروم ہے۔ اِس کے بعد اُس کے اندر اس کے حصول کی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ بڑے جذب و شوق سے کسی شعبۂ علم کی چند بنیادی باتیں اپنے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر یکایک وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا ذہن مزید معلومات قبول کرنے سے ابا کر رہا ہے۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی علمی ترقی کی رفتار رک گئی ہے اور اس کے لیے مزید علم حاصل کرنا بالکل ناممکن ہو گیا ہے۔ مگر یہ اس کی غلط فہمی ہوتی ہے۔ اس منزل پر گو اس کی معلومات میں اضافہ نہیں ہوتا مگر اس نے جو معلومات پہلے حاصل کی ہوتی ہیں اُن کے اندر اس کا ذہن ایک معنوی ربط اور مقصدی ترتیب پیدا کر کے انہیں اس کے لیے مفید اور کار آمد بناتا ہے۔ اور دماغ کا یہ کام پہلے کام سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

جن مفکرین نے ٹھوس مقاصد کی تکمیل کے لیے اٹھنے والی تحریکات کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا ہے ان

کے نزدیک ان تحریکات کو کم و بیش چھ منازل سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلی منزل یہ ہوتی ہے کہ کوئی تاریخ ساز انسان انقلابی دعوت پیش کرتا ہے اور اس دعوت کی روشنی میں وہ رائج الوقت نظاموں اور نظریات کا اِس طرح جائزہ لیتا ہے کہ اس کی دعوت اور ان نظاموں اور نظریات کے مابین جو عظیم فرق ہے اُس کے خطوط بالکل نمایاں ہو جائیں۔ اس سے سوچنے سمجھنے والے دماغوں کے اندر ایک ہلچل پیدا ہوتی ہے اور وہ نئی دعوت اور اس کے فکری و عملی مضمرات پر غور کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر اس دعوت کو ایک تحریک کی شکل دینے کے لیے چند سرپھرے آگے بڑھتے ہیں۔ السابقون الاولون کا یہ گروہ انتہائی مخلص ہوتا ہے اور کسی بڑی سے بڑی قربانی سے گریز نہیں کرتا۔ اس گروہ کے افراد کی سیرتیں بڑی پختہ اور عزائم بڑے بلند ہوتے ہیں۔ ان کی کاوشوں سے دعوت تحریک میں ڈھلتی ہے اور انقلاب کا قافلہ آگے بڑھتا ہے۔ پھر یہ دعوت اور تحریک عوام اور وقت کے غالب نظاموں کی توجہ کا مرکز بنتی ہیں۔ اس مرحلہ پر ایک طرف تو انقلاب کے خواہاں افراد اس کی طرف کھنچتے ہیں اور دوسری طرف اس کی مخالفت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے مگر نہ تو لوگ گروہ در گروہ اس میں شریک ہوتے ہیں اور نہ مخالفت منظم اور مضبوط ہوتی ہے۔ انقلاب کا یہ قافلہ چند قدم آگے بڑھ کر بظاہر رکتا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر اس کی یہ وقتی رکاوٹ اس کے مستقبل کے لیے بڑی ضروری ہوتی ہے کیونکہ وہ ایک مقام پر رک کر اپنے ان ہمسفروں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتا ہے جو سست روی کی وجہ سے پیچھے رہ گئے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنی صفوں کو پھر سے نئے تقاضوں کے تحت ترتیب دیتا ہے اور آنے والے حالات کا جائزہ لے کر اپنے آپ کو نئے سفر کے لیے تیار کرتا ہے۔ یہ مرحلہ اس قافلے کے لیے فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔ اس دوسری منزل سے جب تحریک اپنے قدم آگے بڑھاتی ہے تو پھر جوشیلے اور متحرک لوگوں کی ایک معقول تعداد اس کے ساتھ آشامل ہوتی ہے۔ اس مرحلہ پر ہوش و خرد اور جذبہ و جنون ایک دوسرے کے ہمرکاب ہوتے ہیں اور تمام مخالف قوتیں اس قافلے کے وجود کو اپنے لیے خطرے کا چیلنج سمجھ کر اس کے خلاف صف آرا ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں غیر منظم تصادم کے واقعات بھی دکھائی دینے لگتے ہیں۔ یہ مرحلہ تحریک کے علمبرداروں کے لیے اسی وجہ سے انتہائی تدبر اور دیدہ وری کا طالب ہوتا ہے کہ اس میں مخلص کارکنوں کے ساتھ مفاد پرستوں کی بھی ایک معقول تعداد شامل ہو چکی ہوتی ہے۔ ان مفاد پرستوں کو مختلف درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ اُن طالع آزماؤں پر مشتمل ہوتا ہے جو محض اِس توقع پر اس کا ساتھ دینا شروع کر دیتے ہیں کہ تحریک کی کامیابی سے انھیں چند

دنیوی مفادات حاصل ہو سکیں گے۔ اور دوسرے وہ مفاد پرست جو عوام میں اس کی بڑھتی ہوئی ساکھ سے فائدہ اٹھانے کے آرزومند ہوتے ہیں۔ ان مفاد پرستوں کی علامت یہ ہے کہ یہ پوری یکسوئی کے ساتھ اور اردو محاورے کے مطابق کشتیاں جلا کر اس میں شریک نہیں ہوتے بلکہ اس کے ساتھ اپنی گوناگوں وابستگی کے دعوے کے باوجود دوسرے گروہوں اور دوسری جماعتوں سے بھی نہایت ہی "خوشگوار تعلقات" قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور حالات کے تغیر و تبدل کے ساتھ تعلقات اور وابستگیاں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کا کردار تحریک کے کارکنوں اور خادموں کا سا نہیں ہوتا بلکہ سرپرستوں کا سا ہوتا ہے اور اس گروہ میں زیادہ تعداد معاشرے کے صاحبِ حیثیت اور نمایاں لوگوں کی ہوتی ہے یعنی بڑے بڑے جاگیردار، کارخانہ دار، تجار، اونچی علمی شخصیتیں، ماہرینِ قانون، سرکاری عہدیدار اور سیاسی و مذہبی رہنما۔ اس ضمن میں یہ بات البتہ ذہن نشین رہے کہ تحریک سے محبت کا دعویٰ کرنے والے یہ نمایاں افراد سارے کے سارے غیر مخلص نہیں ہوتے بلکہ ان کی ایک اچھی خاصی تعداد اپنے اس دعوے میں مخلص بھی ہوتی ہے۔ ان میں سے جن لوگوں کے پاس روپے پیسے کی فراوانی ہوتی ہے وہ روپے پیسے سے تحریک کی مدد کرتے ہیں، اہلِ علم علمی سطح پر اسے قوت بہم پہنچاتے ہیں اور دینی رہنما، دینی طبقوں کی طرف سے ہونے والی یلغار کا مقابلہ کرنے میں کسی حد تک تحریک کا ساتھ دیتے ہیں۔ ان حضرات کی خدمات اپنی جگہ کتنی قابلِ قدر ہی سہی مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی یہ ساری خدمات سرپرستی کے دائرے سے آگے نہیں بڑھتیں اور ان میں سے بہت کم افراد کارکنوں کی سطح پر اتر کر کام کرنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے اس طرزِ عمل کے یوں تو متعدد وجوہ ہیں مگر ان میں دو وجوہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ دنیوی مفادات اور جاہ و جلال کے اعتبار سے یہ معاشرے میں جس اونچے مقام پر فائز ہوتے ہیں وہ مقام انہیں اجازت نہیں دیتا کہ وہ کھل کر اور پوری یکسوئی کے ساتھ تحریک کا ساتھ دیں۔ ان کے مفادات اور ان کا بلند مرتبہ و مقام انہیں کارکنوں کے زمرہ میں شامل ہو کر تحریک کی خدمت کرنے کی راہ میں ہمیشہ حائل ہوتا ہے۔ دوسرے خود ان کی اپنی انا بھی انہیں اس کام سے باز رکھتی ہے۔ وہ یہ بات اپنے مرتبہ سے فروتر سمجھتے ہیں کہ کسی تحریک کے ساتھ پوری طرح وابستہ ہو کر اور اپنے آپ کو اس کے نظم کا پوری طرح پابند بنا کر اس کے لیے کوئی کام کر سکیں چنانچہ اس طبقہ کے جتنے ہمدردوں اور قدردانوں سے راقم الحروف کو ملنے کا اتفاق ہوا ہے ان کی باتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بہتر مالی و معاشرتی حیثیت، علمی غرور، پندارِ تقویٰ اور معاشرے میں غیر معمولی اثر و رسوخ انہیں تحریک سے

پوری طرح وابستہ ہونے میں مانع رہتی ہے۔ ان میں سے ہر فرد اپنے آپ کو اتنا اونچا اور بلند سمجھتا ہے کہ کسی دوسرے کی اطاعت اور پیروی کرنا اسے مشکل دکھائی دیتا ہے اس لیے یہ افراد تحریک کی تھوڑی بہت سرپرستی کرنے کے لیے تو تیار ہو سکتے ہیں مگر اس کے ساتھ وابستگی میں یکسو نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ تحریک کی قوت کا اصل سرچشمہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو خواہ علمی اور معاشرتی حیثیت میں ان کی بہ نسبت کہیں زیادہ فروتر ہوں مگر تحریک کے لیے سب کچھ قربان کرنے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں —— اس مرحلہ پر کسی جماعت کے اندر تین گروہ کام کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انتہائی مخلص اور عزم و یقین کے حامل افراد جو سب سے پہلے کسی انقلابی دعوت پر لبیک کہتے ہیں۔ جوشیلے اور سرگرم افراد جو دعوت کے کام کو ولولہ و ہمت کے ساتھ آگے بڑھاتے ہیں۔ ایسے مفاد پرست جو اس سے کسی حد تک وابستہ ہو کر دنیوی مفادات حاصل کرنے کے آرزو مند ہوتے ہیں اور ایسے بااثر مخلص سرپرست جو اسے ایک حد تک قوت تو بہم پہنچاتے ہیں مگر اس کا پوری طرح ساتھ دینے پر تیار نہیں ہوتے۔

دنیا کی ہر تحریک جب اس منزل میں داخل ہوتی ہے تو اسے جہاں باہر کی ہر آن بڑھتی ہوئی مخالفتوں اور مخاصمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہاں داخلی طور پر اس کے لیے بے شمار مسائل پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں ایک طرف جوش و ہوش کے مابین کھینچا تانی شروع ہوتی ہے اور دوسری طرف ہمدرد قسم کے بارسوخ سرپرست اپنے مخصوص مصالح اور مخصوص مزاج کے پیشِ نظر تحریک کو ایک ایسی راہ پر لیجانے کی کوشش کرتے ہیں جس پر عام کارکن گامزن ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ وہ ان کے مشوروں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے بلکہ بسا اوقات انہیں شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس میں وہ کسی حد تک حق بجانب ہوتے ہیں، کیونکہ جو عافیت کوش صرف ساحل پر کھڑے ہو کر دریا کا نظارہ کرنے کے عادی ہوں وہ ان لوگوں کی دقتوں اور مصائب کو نہیں سمجھ سکتے جو طوفان کا مقابلہ کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ اپنی مشکلات کا وہ خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں اس لیے ساحل پر کھڑے رہنے والے ان خیر خواہوں کی باتوں کو وہ توجہ سے نہیں سنتے مگر تحریک کی عوامی حیثیت اسے ان خیر اندیشوں کے مشوروں کو یکسر نظر انداز کرنے میں بھی مانع ہوتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں کسی تحریک کے کارکنوں کی ذہنی یکسوئی متاثر ہونے لگتی ہے اور اس کی رفتار میں بظاہر فرق محسوس ہونے لگتا ہے مگر یہ عارضی کیفیت ہوتی ہے اور تھوڑی سی محنت اور تجربے کے بعد تحریک کے قائدین کو اس امر کا اندازہ

ہو جاتا ہے کہ ان سرپرستوں کی کن باتوں کو وہ قبول کر سکتے ہیں اور کن باتوں کو نہیں ماننا بلکہ مسترد کرنا ہے۔ چنانچہ ان سرپرستوں کے تجربات سے کسی قدر فائدہ اٹھاتے ہوئے قافلہ نئے عزم کے ساتھ رواں دواں ہو جاتا ہے۔

پھر تحریک میں ایک قسم کی داخلی آویزش اس مقام پر بھی شروع ہوتی ہے جہاں جوش، ہوش کے اثر سے آزاد ہو کر آگے بڑھنے کے لیے تگ و دو کرتا ہے۔ ہم پہلے یہ واضح کر چکے ہیں کہ تحریک کے دوسرے مرحلے میں ہوش و جوش ایک دوسرے کے ہم رکاب ہو کر چلتے ہیں، بلکہ جوش اپنی عنان ہوش کے ہاتھ میں دے کر اپنے آپ کو آگے بڑھاتا ہے تاکہ وہ کسی غلط راہ پر نہ چل پڑے۔ جوش کی عملی میدان میں کارکردگی چونکہ زیادہ دکھائی دیتی ہے اس لیے اسے جلد ہی اپنی قوت اور کامرانیوں کا احساس ہونے لگتا ہے اور وہ ہوش کی گرفت سے آزاد ہو کر جولانیاں دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ خرد قافلے کو اعتدال اور حزم و احتیاط کے ساتھ آگے بڑھانے کے منصوبے بناتی ہے اور راستے میں جو موانع حائل ہوں انہیں حکمت اور تدبر کے ساتھ دور کرنے کی سعی کرتی ہے۔ اس کے مقابلے میں جوش و جنون تحریک کو طوفان کی صورت میں سرگرم عمل دیکھنا چاہتے ہیں اور اس بات کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ جو مسافت کسی انقلابی قافلے کو سالوں میں طے کرنی ہے وہ دنوں میں طے کر کے منزل مقصود پر پہنچ جائے۔ جوش و جنون کا علمبردار کسی تحریک کا نوجوان طبقہ ہوتا ہے اور چونکہ اس طبقہ میں کام کرنے کی قوت نسبتاً زیادہ ہوتی ہے اس لیے تحریک پر آہستہ آہستہ یہ طبقہ غالب آنے لگتا ہے اور اگرچہ قیادت اس کے ہاتھ میں نہیں ہوتی لیکن عملاً بات زیادہ اسی کی چلتی ہے اور اگر ہوش، جوش کو اعتدال کے اندر رہنے پر مجبور کرے تو جوش اسے اپنے آپ پر ناروا قدغن سمجھ کر قافلے سے الگ ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اس رفتار کے ساتھ آگے بڑھنا پسند نہیں کرتا جس رفتار کے ساتھ خرد آگے بڑھانا چاہتی ہے۔ اس آویزش میں بھی مختلف مقامات پر کسی تحریک کے قدم رکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں لیکن جس تحریک میں اخلاص ایک غالب عنصر کی حیثیت سے شامل ہو اس کے اندر ہوشمند قائدین اور پرجوش متبعین کے درمیان اعتدال کی راہ نکالنا کچھ مشکل نہیں ہوتا اور جلد ہی ایک ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے جس میں خرد اور جنون کے مابین مفاہمت پیدا ہو سکتی ہے۔ ہوش جوش و جنون کی امنگوں کو سامنے رکھ کر اس کے لیے ایک معقول لائحہ عمل تیار

کرتا ہے اور اس معاملے میں اس کی فطری جولانیوں کا پورا خیال رکھتا ہے۔ دوسری طرف جنون بھی اپنے آپ کو بے لگام ہونے نہیں دیتا بلکہ راہِ توسط و اعتدال اختیار کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ خرد اور جنون کی اس مفاہمت سے تحریک میں قوت پیدا ہوتی ہے اور قافلۂ انقلاب زیادہ مستعدی سے آگے بڑھتا ہے۔

بالغ نظر قیادت کا تدبر، اہلِ نظر سرپرستوں کا تجربہ و مشاہدہ اور نوجوانوں کا جوش و ولولہ۔۔۔ اس زادِ راہ کے ساتھ کوئی تحریک چوتھے مرحلے میں داخل ہوتی ہے۔ اور یہ مرحلہ اس کے لیے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس مرحلے میں اسے مخالف قوتوں کے ساتھ فیصلہ کن پنجہ آزمائی کرنا پڑتی ہے۔ اگر کوئی تحریک اپنے نظم و ضبط، بلند حوصلگی اور صاحبِ فراست قیادت کی وجہ سے اپنے آپ کو داخلی انتشار سے بچا بھی لے تو وہ بیرونی یلغار سے بہرحال بچ نہیں سکتی۔ اس کی مخالف قوتیں اسے غیر موثر طاقت سمجھ کر کسی صورت بھی نظر انداز کرنے پر آمادہ نہیں ہوتیں بلکہ اس کا راستہ روکنے اور اس کا زور توڑنے کے درپے ہو جاتی ہیں اور اس کے وجود کو وقت کا سب سے بڑا خطرہ سمجھ کر اس کے خلاف پوری قوت سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔

ان مخالفتوں کی نوعیت بھی بڑی پیچیدہ اور ان کے میدان بڑے مختلف ہیں اور ان کا سب سے خوفناک پہلو یہ ہوتا ہے کہ یہ مخالفتیں اپنے اپنے دائروں میں بھی تحریک کا راستہ روکنے کی کوشش کرتی ہیں اور اس کام کے لیے اپنے آپ کو مجتمع بھی کر لیتی ہیں اور اگر وہ ضرورت محسوس کریں تو کسی ملک کی اندرونی قوتوں سے نہیں بلکہ باہر کی قوتوں سے بھی بھرپور فائدہ اٹھاتی ہیں اور اسی طرح تحریک کی بڑھتی ہوئی طاقت کو منتشر کرنے کے لیے پورا زور صرف کر دیتی ہیں۔ اصل صورتِ حال سے بے خبر لوگ تحریک کے کارکنوں، ہمدردوں اور دوسرے خیر خواہوں سے بڑے استعجاب کے ساتھ بار بار یہ سوال کرتے ہیں کہ آخر ایک دنیا تمہاری مخالفت پر کیوں کمربستہ ہو گئی ہے؟ یہ سوال بذاتِ خود اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ان حضرات کو نظریات و افکار کی غیر معمولی اثر آفرینی اور قوت کا کچھ اندازہ نہیں اور انہیں اس

(باقی بر صفحہ ۴۸ پر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان

(۳)

حضرت اسماعیلؑ کی رسالت اور عرب میں اس کے اثرات اغلب یہ ہے کہ جس وقت حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے خانۂ کعبہ تعمیر کیا اور اس گھر کو مرکز و مرجع قرار دے کر ہر سال اس کی طرف حج کرنے کا اذن عام لوگوں کو دیا، وہی وقت تھا جب حضرت اسماعیلؑ کو اللہ تعالیٰ نے رسالت کے منصب پر سرفراز فرمایا تاکہ وہ عرب میں دین اسلام کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیں۔ قرآن مجید میں ان کے متعلق فرمایا گیا ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ	اور اس کتاب میں اسماعیل کا ذکر کر، وہ
صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۔	وعدے کا سچا اور رسول نبی تھا۔ وہ اپنے گھروالوں
وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ	کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور اپنے رب کے
عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ۔ (مریم ۔ ۵۴-۵۵)	نزدیک پسندیدہ تھا۔

اگرچہ تاریخ میں حضرت اسماعیلؑ کی زندگی کے حالات اور ان کی رسالت کے کام کی کچھ تفصیلات نہیں ملتیں، لیکن اُن کی رسالت کے کامیاب ہونے کا واضح ثبوت یہ ہے کہ خانۂ کعبہ کو تمام عرب میں مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی۔ حج اور عُمرے کے لیے عرب کے تمام اطراف و نواحی سے لوگ کھنچ کھنچ کر آتے رہے۔ مناسک حج تقریباً وہی رہے جو ابتدا میں مقرر کیے گئے تھے۔ صفا اور مروہ کی سعی اور ۱۰ ذی الحجہ کو منیٰ میں قربانی کا طریقہ بھی عربوں میں رائج رہا جو بلاشبہ حضرت ہاجرہ کی سعی اور حضرت ابراہیم کی قربانی ہی کی یادگار تھا۔ حج اور عُمرے کی خاطر چار مہینوں کی حُرمت بھی تمام اہلِ عرب میں مسلّم رہی، اور دین ابراہیمی کے دوسرے بہت سے شعائر بھی عربوں میں مروّج رہے، مثلاً ختنہ، غسل جنابت، جانوروں کو ذبح کرنے اور اونٹوں کو نحر کرنے کا طریقہ، مُردوں کو دفن کرنا، نکاح اور طلاق اور احداد (بیوہ کے سوگ) کے قاعدے، بیٹیوں، ماؤں اور بہنوں کو حرام سمجھنا، قصاص اور دیت اور قسامت کے احکام وغیرہ۔ اس کے علاوہ بعض حکمائے عرب وضو بھی کرتے تھے۔ بعض نماز بھی پڑھتے تھے جیسے قُس بن ساعدۃ الایادی۔ حضرت ابوذر بھی اسلام قبول کرنے سے تین سال پہلے ہی نماز پڑھنے لگے

تھے ،اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ وہ کس قسم کی نماز تھی۔ اس کے علاوہ عربوں میں روزہ کا بھی ایک طریقہ رائج تھا۔ وہ اعتکاف بھی کرتے تھے، چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جاہلیت میں ایک رات کے اعتکاف کی نذر مانی تھی۔ بہت سی چیزوں کو اہل عرب نیکی کے کام سمجھتے اور ان کی مدح کرتے تھے، مثلاً مہمان اور مسافر کی ضیافت، مساکین کی مدد کرنا اور صلۂ رحمی کرنا۔ اگر حضرت اسماعیلؑ کی رسالت کو عرب میں غیر معمولی کامیابی حاصل نہ ہوئی ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ ڈھائی ہزار برس تک جاہلیت کی تاریکی میں ڈوبے رہنے کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک اُس دین کے آثار باقی اور تمام عرب میں جاری و ساری رہتے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اُن کی اور اُن سے متأثر ہونے والوں کی تبلیغ ہی کا یہ اثر تھا کہ اہل عرب میں حضورؐ کی بعثت کے زمانے تک اللہ تعالیٰ کے متعلق وہ تصورات پائے جاتے تھے جن کا ذکر قرآن مجید میں جگہ جگہ کیا گیا ہے (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو سورۂ زُخرُف، آیت ۸۷۔ سورۂ عنکبوت، آیات ۶۱ تا ۶۳۔ سورۂ مومنون، آیات ۸۴ تا ۸۹۔ سورۂ یونس، آیات ۲۲۔۲۳ و ۳۱۔ سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۶۷)۔

اور یہ بھی رسالتِ اسماعیلی کا اثر ہی تھا کہ بعثت محمدیؐ کے وقت تک عرب میں ایسے لوگوں کا ایک گروہ موجود رہا جنہیں تاریخ میں حُنفاء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ عرب کے مختلف قبائل میں جگہ جگہ پائے جاتے تھے، شرک سے انکار اور توحید کا اقرار کرتے تھے اور دینِ ابراہیمی کی پیروی کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے تفہیم القرآن، جلد چہارم میں صفحہ ۲۷ پر ان لوگوں کی فہرست درج کی ہے۔ ذیل میں ہم ان میں سے بعض کے حالات لکھتے ہیں:

النابغۃ الجعدی۔ یہ بنی عامر بن صعصعہ میں سے تھے۔ جاہلیت کے زمانے میں دینِ ابراہیمی اور حنیفیت کا ذکر کیا کرتے تھے۔ روزے رکھتے اور استغفار کرتے تھے۔ ان کے زمانۂ جاہلیت کے کلام میں توحید اور حیات بعدِ موت اور جزا و سزا اور جنت و دوزخ کا ذکر ملتا ہے۔ بعد میں انہوں نے اسلام قبول کیا (الاستیعاب ج ۱، ص ۳۱۰)۔

صِرمہ بن اَنس۔ یہ بنی عدی بن نجّار میں سے تھے۔ جاہلیت کے زمانے میں درویشی اختیار کر لی تھی۔ بت پرستی چھوڑ دی تھی۔ غسل جنابت کرتے اور حائضہ سے پرہیز کرتے تھے۔ شراب اور ہر نشہ آور چیز کو ناپسند کرتے تھے۔ پہلے عیسائی ہونے کا ارادہ کیا، پھر رک گئے اور ایک مسجد سی بنائی جس میں کسی جُنبی یا حائضہ کو نہیں آنے دیتے تھے۔ کہتے تھے کہ میں ربِ ابراہیم کی عبادت کرتا ہوں اور دینِ ابراہیمی کا پیرو ہوں۔ ان کا ایک شعر یہ ہے:

الحمد للہ ربی لا شریک لہ

من لم یقلہا فنفسہ ظلما

"تعریف میرے رب اللہ کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ جو شخص اس کا قائل نہیں ہے

وہ اپنے نفس پر آپ ظلم کرتا ہے"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو یہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ انہوں نے حاضر ہو کر اسلام قبول کیا (الاستیعاب، ج ۱، ص ۳۲۲۔ الاصابہ، ج ۲، ص ۱۷۹۔ ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۵۶)۔

عَمرو بن عَبَسَہ۔ یہ بنی سُلیم میں سے تھے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ اسلام سے پہلے انہوں نے بتوں کی پرستش چھوڑ دی تھی۔ امام احمد نے ان کا اپنا قول نقل کیا ہے کہ میں جاہلیت کے زمانے میں لوگوں کو گمراہی پر سمجھتا تھا اور بتوں کے متعلق میرا خیال تھا کہ یہ کچھ نہیں ہیں۔ ان کا ایک اور قول یہ نقل کیا گیا ہے کہ میرے دل میں یہ بات ڈال دی گئی تھی کہ بتوں کی پرستش باطل ہے۔ ایک شخص نے میری یہ باتیں سنیں تو کہا کہ مکہ میں ایک شخص ہے جو ایسی ہی باتیں کہتا ہے۔ چنانچہ میں مکہ آیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر آپ کی تعلیمات دریافت کیں اور آپ کی رسالت پر ایمان لے آیا (الاستیعاب، ج ۲، ص ۴۳۱)۔

سب سے زیادہ سبق آموز قصہ زید بن عَمرو بن نُفَیل کا ہے جو حضرت عمرؓ کے چچا زاد بھائی اور حضرت سعیدؓ بن زید (حضرت عمرؓ کے بہنوئی اور یکے از عشرۂ مبشرہ) کے والد تھے۔ یہ توحید کے عقیدے میں بہت سخت تھے۔ بت پرستی، اور مردار اور خون اور بتوں پر کی ہوئی قربانی کو حرام سمجھتے تھے۔ بیٹیوں کے قتل کو بہت برا جانتے تھے اور ان کو بچانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہودیت اور نصرانیت کو بھی انہوں نے رد کر دیا تھا اور کہتے تھے کہ ہماری قوم کے شرک اور ان کے شرک میں آخر فرق ہی کیا ہے۔ حضرت اسماءؓ بنت ابی بکر کا بیان ہے کہ "میں نے زید بن عَمرو کو دیکھا کہ وہ کعبہ کی دیوار کے سہارے بیٹھے تھے اور کہتے تھے کہ قریش کے لوگو، خدا کی قسم میں کسی ایسے جانور کا گوشت نہیں کھاؤں گا جو اللہ کے سوا کسی کے لیے ذبح کیا گیا ہو۔ خدا کی قسم دین ابراہیم پر میرے سوا کوئی نہیں ہے" وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ "خدایا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تیری عبادت کا کونسا طریقہ تجھے سب سے زیادہ محبوب ہے تو میں اسی طرح تیری عبادت کرتا" پھر وہ اپنی ہتھیلی پر سر رکھ کر سجدہ کرتے۔ انہوں نے دین ابراہیمی کی تلاش میں شام کا سفر کیا مگر وہ نہ یہود میں ملا اور نہ نصاریٰ میں۔ اس پر انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر کہا "خدایا میں تجھے گواہ کرتا ہوں کہ میں دین ابراہیم پر ہوں" آخر کار بلادِ لخم میں حضورؐ کی بعثت سے پانچ سال پہلے کسی نے انہیں

قتل کر دیا۔ ان کا چچا خطاب ان کو دین آبائی سے پھر جانے پر سخت تنگ کرتا تھا حتیٰ کہ اس نے انہیں مکہ سے نکل جانے پر مجبور کر دیا اور قریش کے سفہاء کو ان کے پیچھے لگا دیا کہ اسے شہر میں نہ گھسنے دو۔ زمانۂ اسلام میں حضرت عمرؓ اور حضرت سعیدؓ بن زید نے حضورؐ سے عرض کیا کہ زید کے خیالات آپ کو معلوم ہیں، کیا ہم ان کے لیے دعائے مغفرت کریں۔ آپؐ نے فرمایا "ہاں، قیامت کے روز وہ تنہا ایک امت کی حیثیت سے اٹھیں گے۔" (الاستیعاب، ج ۲، ص ۵۳۹۔ الاصابہ، ج ۱، ص ۵۵۲۔ ابن ہشام، ج ۱، ص ۲۳۹ - ۲۴۰)۔

تاہم عام اہل عرب جس شرک میں مبتلا تھے اس کی نوعیت ان کے اُس تلبیہ سے معلوم ہوتی ہے جو وہ حج کے موقع پر کرتے تھے۔ اُن کا تلبیہ یہ تھا:

لبیك اللّٰھم لبیك، لبیك لاشریك لك الا شریکا ھو لك، تملکہ وما ملك	میں حاضر ہوں میرے اللہ میں حاضر ہوں۔ میں حاضر ہوں، کوئی تیرا شریک نہیں سوائے اُس شریک کے جو تیرا ہی ہے، تو اُس کا بھی مالک ہے اور ہر اُس چیز کا بھی مالک جس کا وہ مالک ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے بت سے مفروضہ خداؤں کو معبود ماننے کے باوجود ایک ربِّ اعلیٰ کی حیثیت سے اللہ کو مانتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ان کے تمام معبود اُس بزرگ و برتر ہستی کے بندے اور مملوک ہیں۔ اِس کو رسالتِ اسماعیلی کے اثرات کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ انتہائی جاہلیت اور بدترین شرک میں ڈوب کر بھی اللہ کے بارے میں اُن کے اندر یہ عقیدہ موجود تھا۔

حضرت اسماعیلؑ کے بعد خانہ کعبہ کی تولیت کا انتظام حضرت اسماعیلؑ جب تک زندہ رہے، خانۂ کعبہ کی تولیت انہی کے ہاتھ میں رہی اور ان کے بعد ان کے بڑے بیٹے نابت متولی ہوئے۔ لیکن نابت کی وفات کے بعد جُرہُم کے لوگ، جو مکہ میں حضرت ہاجرہ کے وقت سے بسے ہوئے تھے، اِس گھر کی تولیت پر قابض ہو گئے اور صدیوں تک قابض رہے۔ اِن لوگوں میں رفتہ رفتہ اتنا بگاڑ پیدا ہو گیا کہ انہوں نے مکہ کی حرمت کو پامال کرنا شروع کر دیا۔ کعبہ میں جو مال ہدیۃً دیا جاتا تھا اسے ناجائز طور پر کھانے لگے۔ زیارت کے لیے آنے والوں کو ستانے لگے۔ یہاں تک کہ ان میں سے جب کسی کو زنا کے لیے کوئی جگہ نہ ملتی تو وہ خانۂ کعبہ میں جا کر یہ گناہ کرتا تھا۔ اِسی زمانے کا یہ واقعہ ہے کہ ایک شخص اساف نے ایک عورت نائلہ کے ساتھ کعبہ میں یہ فعل حرام کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو مسخ کر دیا۔ کچھ مدت تک تو یہ واقعہ نشانِ عبرت بنا رہا۔ مگر ایک مدت بعد ان دونوں کے

بت بنا کر ایک کو صَفا پر اور دوسرے کو مَروہ پر رکھ کر ان کی عبادت کی جانے لگی۔ یہ اُس تنزّل کی انتہا تھی جس میں خانۂ کعبہ کے یہ متولی مبتلا ہو گئے تھے۔

آخر کار جب جُرہمیوں کی زیادتیاں حد سے بڑھ گئیں تو بنی کنانہ میں سے بنی بکر بن عبد مَناۃ اور بنی خُزاعہ میں سے غُبشان نے مل کر اُن سے جنگ کی اور اُن کو مکہ سے نکال دیا۔ چلتے ہوئے یہ لوگ زمزم کو بند کر کے اُس کا نشان تک مٹا گئے اور اپنے اصل وطن، یمن کا راستہ لیا۔ اُن کے بعد کعبہ کی تولیت بنی خُزاعہ کی اُس شاخ کے قبضے میں آگئی جو غُبشان کے نام سے موسوم ہے۔ تین چار سو برس تک وہی اس مقدس گھر کے متولی رہے اور انھی کے زمانہ میں خانہ کعبہ ایک پورا بت خانہ بن گیا۔ اِس کی ابتدا اِس طرح ہوئی کہ اس قبیلے کا سردار عَمرو بن لُحَی ایک مرتبہ شام گیا اور وہاں اُس نے لوگوں کو بتوں کی پرستش کرتے دیکھا۔ اسے یہ چیز بہت پسند آئی، وہاں سے ہُبَل نامی ایک بت لے آیا اور کعبہ میں اسے نصب کر دیا۔ رفتہ رفتہ اس پر مزید بتوں کا اضافہ ہوتا چلا گیا۔ انھی میں حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ اور حضرت مریمؑ کے بت بھی شامل تھے۔ حضرت مریم کا بُت غالباً اس لیے رکھا گیا تھا کہ عیسائی عرب بھی کعبہ کی طرف رجوع کریں۔ بخاری، کتاب الانبیاء میں حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ کعبہ میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت مریمؑ کی تصویریں بھی تھیں۔ دوسری روایت میں یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی صورت اِس شکل میں تھی کہ دونوں کے ہاتھوں میں اَزلام (پانسے) تھے۔

کعبہ کی تولیت پر خُزاعہ کا قبضہ اُس وقت ختم ہوا جب قریش میں سے قُصَیّ بن کلاب نے اُسے اپنے خُزاعی خُسر سے حاصل کیا، جیسا کہ آگے چل کر ہم بیان کریں گے۔

اولادِ اسماعیل علیہ السلام عرب کے علماء انساب اور بائیبل کا متفقہ بیان یہ ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کے بارہ بیٹے تھے۔ مگر جب مکہ پر جُرہمیوں کا قبضہ ہو گیا تو اولادِ اسماعیل کا بہت تھوڑا حصہ اس شہر میں بسا رہ گیا، باقی سب عرب کے مختلف حصوں میں منتشر ہو گئے۔ تاریخ اس باب میں خاموش ہے کہ اِن بارہ بیٹوں کی اولاد کہاں کہاں گئی اور کون کون سے قبائل ان کی نسل سے پیدا ہوئے۔ البتہ عرب کے علم الانساب میں جو چیز محفوظ اور معتبر ہے اور جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے وہ یہ ہے کہ عَدنان حضرت اسماعیلؑ کے بڑے بیٹے نابِت کی اولاد میں سے تھا۔ عدنان سے پہلے حضرت اسماعیلؑ تک کتنی پشتیں گزریں، اس میں سخت اختلاف ہے، اور عدنان سے اوپر کا کوئی شجرۂ نسب محفوظ نہیں ہے۔ عُروہ بن زُبیر کا قول ہے کہ ہمیں کوئی ایسا آدمی نہیں ملا جو عدنان اور حضرت اسماعیلؑ

کے درمیان کا نسب نامہ جانتا ہو۔ ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ، دونوں کہتے ہیں کہ عدنان سے اوپر کا نسب نامہ جو لوگ بیان کرتے ہیں وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ نسب نامہ صرف عدنان تک بیان کرنا چاہیے۔ طبقات ابن سعد میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہ منقول ہے کہ آپ مَعَد بن عدنان بن اُدَد تک نسب بیان کرنے کے بعد فرماتے کذب النسابون "آگے کا نسب بیان کرنے والے جھوٹے ہیں"۔ لیکن اوپر کا شجرۂ نسب محفوظ نہ ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عدنان کا اولادِ اسماعیل میں سے ہونا کسی درجہ میں بھی مشکوک ہے۔ تمام اہل عرب اس بات پر متفق تھے کہ عدنان بنی اسماعیل میں سے تھا، اور اہل عرب کا اس پر بالکل متفق ہونا اس کے صحیح ہونے کا ناقابل انکار ثبوت ہے، کیونکہ عرب کے لوگ نسب کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور ان کے لیے کسی کے نسب پر متفق ہو جانا اُس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک اُن کے ہاں نسلاً بعد نسلٍ اس کے بارے میں متواتر روایات موجود نہ ہوں۔

رسول اکرمؐ کا نسب نامہ اور قبائل عرب سے آپ کا رشتہ

عدنان کے بعد تمام اُن قبائلِ عرب کا نسب نامہ محفوظ ہے جو اولادِ عدنان ہی سے ہیں اور اس میں علمائے انساب کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہم یہاں پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرۂ نسب درج کرتے ہیں۔ اس کے بعد یہ بتائیں گے کہ کس کس پُشت پر عرب کے کون کون سے قبائل آپ کے ساتھ نسب میں شریک ہو جاتے ہیں۔ حضورؐ کا شجرۂ نسب یہ ہے:

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، بن عبداللہ، بن عبدالمطلب، بن ہاشم، بن عبدِ مناف، بن قُصَیّ، بن کِلاب، بن مُرّہ، بن کعب، بن لُؤَیّ، بن غالِب، بن فِہر، بن مالک، بن النَّضر، بن کِنانہ، بن خُزَیمہ، بن مُدرِکہ، بن اِلیاس، بن مُضَر، بن نِزار، بن مَعَدّ، بن عدنان۔

اِس سلسلۂ نسب میں ہر پُشت کے جدِّ اعلیٰ پر عرب کے حسب ذیل قبائل حضورؐ کے ہم نسب ہوتے چلے جاتے ہیں۔

عدنان پر اس کے دوسرے بیٹے عَک کی اولاد جو یمن جا کر بس گئی اور اَشعَریوں میں (جو حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا قبیلہ تھا) اُس کے شادی بیاہ کے تعلقات قائم ہو گئے۔

مَعَد پر بنی قُضاعہ اور بنی ایاد۔

نِزار پر بنی اَنمار (خَثعَم اور بَجیلہ)، تمام قبائل رَبیعہ (جن میں بنی بکر بن وائِل، تَغلِب اور حنیفہ وغیرہ شامل ہیں)، بنی عبدالقیس، عَنَزہ اور نمر بن قاسط۔

مُضَر پر تمام قبائلِ قیس (سُلیم، مازِن، فزارہ، عَبس، اَشجع، مُرّہ، ذُبیان، غطفان، عُقیل، قُشیر جُشَم، ثَقیف، باہلہ، بنی سعد بن بکر اور تمام بنی ھَوازِن وغیرہ) حضورؐ کی رضاعی والدہ حلیمہ بنی سعد بن بکر میں سے تھیں۔

اَلیاس پر بنی تمیم، بنی ضَبّہ، مُزینہ، خُزاعہ، اَسلم، عُکل، تَیم وغیرہ۔

مُدرکہ پر ہُذَیل۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اسی قبیلے سے تھے۔

خُزیمہ پر بنی اَسد، قارہ اور تمام بنی الھُون بن خزیمہ۔

کنانہ پر بنی عبدِ مَناۃ (جن میں بنی بکر اور بنی ضَمرہ شامل ہیں)، بنی مالک، بنی مَلکان یا مِلکان اور بنی حُدال وغیرہ۔ بنی فِراس اور بنی فُقَیم بھی اولادِ کنانہ میں سے ہیں۔ حضرت ابوذر کا قبیلہ غفار بنی ملکان میں سے تھا۔

قریش علمائے انساب کا ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ النَّضر بن کنانہ ہی کا لقب قریش تھا۔ لیکن محققین کہتے ہیں کہ قریش دراصل النضر کے پوتے اور مالک بن النضر کے بیٹے فِہر کا لقب تھا۔ جو لوگ اُس کی اولاد ہیں وہ قریش میں شامل ہیں اور جو اس کی اولاد نہیں ہیں وہ قریش میں سے نہیں ہیں[1]۔

اب حضورؐ کے نسب نامہ کی طرف پھر رجوع کیجیے اور دیکھیے کہ قریش کے کون کون سے خاندان کس پُشت میں حضورؐ کے ساتھ نسب میں شریک ہوتے ہیں۔

فِہر پر بنی مُحارب، اور بنی الحارث۔ حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح بنی الحارث کی ایک شاخ سے تھے۔

---

[1] قریش کے معنی میں اختلاف ہے۔ ایک معنی پراگندہ ہونے کے بعد جمع ہونے کے ہیں۔ مگر اس معنی کے لحاظ سے قُریش قُصَیّ بن کلاب ہی کا لقب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اُسی کے زمانے میں قریش کے تمام خاندان مکہ میں جمع ہوئے۔ دوسرے معنی کسب و تجارت کے ہیں جو قریش کا پیشہ تھا۔ تیسرے معنی تفتیش کے ہیں۔ اس لحاظ سے قریش نَضر بن کنانہ کا لقب قرار پاتا ہے، کیونکہ اُس کے متعلق عرب کی روایات میں یہ منقول ہے کہ وہ حاجتمند لوگوں کی حاجات کا تجسُّس کرتا تھا اور اُن کی مدد کیا کرتا تھا۔ ایک اور معنی یہ ہیں کہ قریش سمندر کے ایک بڑے جانور کا نام ہے جو ہر چیز کو کھا جاتا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ قریش بن بدر بنی نضر بن کنانہ میں سے ایک شخص تھا جو اپنے قبیلے کے قافلوں کے لیے بدرقہ اور رسد رسانی کا انتظام کرتا تھا۔ اس لیے عرب اس قبیلے کے قافلہ کو دیکھ کر کہتے تھے کہ قریش کا قافلہ آگیا۔ یہ مختلف اقوال ہیں۔ مگر تحقیق یہی ہے کہ قریش بنی فِہر کا لقب ہے۔

غالب بن فہر پر بنی تیم الادرم۔

لؤی بن غالب پر بنی عامر۔ اسی خاندان کی ایک شاخ سے فاطمہ بنت زائدہ ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی والدہ تھیں۔ اسی خاندان کی ایک دوسری شاخ سے سہیلؓ بن عمرو تھے جنھوں نے کفر کی حالت میں صلح حدیبیہ کی شرائط طے کی تھیں اور اپنے بیٹے ابوجندل پر سخت ظلم ڈھائے تھے۔ پھر فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا اور حضورؐ کی وفات کے بعد جب مکہ میں ارتداد کا میلان ابھرنے لگا تو یہی اُس کو روکنے کے لیے سینہ سپر ہو گئے۔ اسی خاندان کی ایک اور شاخ سے ام المومنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا تھیں۔

کعب بن لؤی پر بنی عدی، بنی جمح، اور بنی سہم۔ حضرت عمرؓ بنی عدی کے ایک خاندان سے تھے۔ حضرت عثمانؓ بن مظعون بنی جمح میں سے تھے۔ اور حضرت عمروؓ بن عاص کا تعلق بنو سہم کے ایک خاندان سے تھا۔

مرہ بن کعب پر بنی تیم اور بنی مخزوم۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بنی تیم میں سے تھے۔ حضرت طلحہؓ بھی اسی خاندان سے تھے۔ ام المومنین حضرت امؓ سلمہ اور ان کے پہلے شوہر حضرت ابوؓ سلمہ بنی مخزوم میں سے تھے اور اسی خاندان کا ایک فرد ابوجہل تھا۔ حضرت عمر کی ماں حنتمہ بنت ہشام بھی اسی خاندان سے تھی اور اس رشتے سے ابوجہل بن ہشام اُن کا ماموں ہوتا تھا۔ حضرت ارقمؓ، جن کا دارارقم حضورؐ کی دعوتِ رسالت کے دور میں بڑی اہمیت رکھتا تھا، وہ بھی مخزومی تھے۔ اسی خاندان کی ایک شاخ سے حضرت خالدؓ بن ولید تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی دادی فاطمہ بنت عمرو بھی مخزومیہ تھیں جن سے حضورؐ کے والد اور آپ کے چچا ابوطالب اور زبیر پیدا ہوئے۔

کلاب بن مرہ پر بنی زہرہ۔ حضورؐ کی والدہ ماجدہ بی بی آمنہ، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف بنی زہرہ ہی میں سے تھے۔ حضرت حمزہؓ کی والدہ ہالہ بنت اُہیب بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور وہ حضورؐ کی والدہ بی بی آمنہ کی چچازاد بہن تھیں۔

قصی بن کلاب پر بنی عبدالعزیٰ اور بنی عبدالدار۔ ام المومنین حضرت خدیجہؓ، حضرت زبیرؓ بن العوام، ورقہ بن نوفل اور حضرت حکیمؓ بن حزام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے) سب بنی عبدالعزیٰ ہی میں سے تھے۔ حضورؐ کی نانی برہ بنی عبدالدار میں سے تھیں اور اسی خاندان کی ایک شاخ سے حضرت مصعبؓ بن عمیر کا تعلق تھا۔

عبد مناف بن قصی پر بنی المطلب، بنی عبد شمس اور بنی نوفل۔ تمام بنی امیہ عبد شمس کی اولاد تھے۔ اس خاندان کی ایک شاخ سے مشہور دشمن اسلام عقبہ بن ابی معیط تھا، دوسری شاخ سے ام جمیل (ابولہب کی بیوی حمالۃ الحطب)، ابوسفیان اور اُن کی بیٹی ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ تھیں، تیسری شاخ سے امیرالمومنین حضرت

عثمان بن عفانؓ تھے، اور چوتھی شاخ سے مروان کا باپ حکم۔ عبد شمس کی اولاد ہی میں سے مشہور دشمن اسلام عُتبہ اور شَیبہ بھی تھے۔ عُتبہ کی بیٹی ہندہ (ابوسفیان کی بیوی) اور بیٹے حضرت ابو حُذیفہؓ تھے۔ شَیبہ فتح مکہ کے وقت تک کلید بردار کعبہ تھا اور فتح مکہ کے بعد اسی کو آپؐ نے اس منصب پر برقرار رکھا، حتیٰ کہ آج تک کلید برداری کعبہ اسی کے خاندان میں چلی آرہی ہے۔ بنی نوفل میں سے حضرت جُبیرؓ بن مُطعم تھے۔ اور بنی المُطلب وہ خاندان تھا جس نے زمانۂ رسالت سے پہلے بھی ہر تنگی و ترشی میں بنی ہاشم کا ساتھ دیا اور زمانۂ رسالت کے بعد بھی وہ بنی ہاشم کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت میں سینہ سپر رہا۔ مُطّلب کو اس کی خوبصورتی کی بنا پر قمر کہا جاتا تھا۔

ہاشم بن عبد مناف پر تمام بنی ہاشم۔ ہاشم کی ایک بیوی بنی قُضاعہ سے تھی۔ نَضلہ بن ہاشم اور شِفاء بنت ہاشم اسی بیوی سے تھے۔ ان کی دوسری بیوی بنی مازن سے تھی جس سے خالدہ بنت ہاشم اور ضَعیفہ بنت ہاشم پیدا ہوئیں۔ تیسری بیوی بنو خزاعہ سے تھی۔ جس سے اسد بن ہاشم پیدا ہوا۔ چوتھی بیوی مدینے کی ہند بنت عمرو بن ثعلبہ خزرجیہ تھی۔ جس سے ایک بیٹی حَیَّہ اور ایک بیٹا ابوصَیفی پیدا ہوا۔ پانچویں بیوی بھی مدینہ کے ایک اور خزرجی خاندان بنی النجّار میں سے تھیں۔ جن کا نام سلمٰی بنت عَمرو تھا۔ یہی عبدالمطلب اور ان کی ایک بہن رُقیہ کی ماں تھیں۔ اس طرح پہلے ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رشتہ داری اہلِ مدینہ سے قائم ہو چکی تھی۔

عبدالمطلب پر تمام بنی عبدالمطلب۔ ان کی ایک بیوی فاطمہ بنت عَمرو بن عائذ بنی مخزوم میں سے تھیں جن سے حضوؐر کے والد ماجد عبداللہ، اور دو چچا ابو طالب، اور زبیر، اور پانچ پھوپھیاں بَرّہ، ام الحکیم البیضاء، عاتکہ، اُمیمہ اور اَروی پیدا ہوئیں۔ حضرت ابوسَلمہ اور ابوسَبرہ بَرّہ کے بیٹے تھے۔ ام الحکیم البیضاء حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نانی تھیں۔ اُمیمہ حضرت عبداللہ بن جحشؓ اور ام المومنین حضرت زینبؓ کی والدہ تھیں۔ عبدالمطلب کی دوسری بیوی ہالہ بنت اُہیب بنی زُہرہ میں سے تھیں اور حضوؐر کی والدہ بی بی آمنہ کی چچا زاد بہن تھیں۔ ان سے حضوؐر کے تین چچا، حضرت حمزہؓ، مُقوّم اور حَجْل پیدا ہوئے۔ آپؐ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ بھی انہی بیوی کے بطن سے تھیں جن کے صاحبزادے حضرت زُبیرؓ بن العوّام تھے۔ اُن کے والد عوّام بن خُویلد حضرت خدیجہ کے بھائی تھے۔ عبدالمطلب کی تیسری بیوی نُتیلہ بنت جناب بنی النمر بن قاسط میں سے تھی جس سے حضرت عباسؓ اور ضرار پیدا ہوئے۔ ان کی ایک اور بیوی سَمراء بنت جُندب بنی بکر بن ہوازن میں سے تھی جس سے حارث بن عبدالمطلب پیدا ہوا۔ اُن کی ایک اور بیوی لُبنیٰ بنت ہاجرہ بنی خزاعہ میں سے تھی جس سے ابولہب پیدا ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس نسب نامے اور قبائل عرب کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ آپ کے تعلق کی اِن تفصیلات پر نگاہ ڈالنے سے چند باتیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں۔

اول، یہ کہ دنیا کے کسی ایک مذہب کے پیشوا، اور کسی ایک دنیوی نظام کے بانی کے متعلق بھی تاریخ میں اتنی معلومات موجود نہیں ہیں جن سے اس قدر تفصیل کے ساتھ اس کے حسب نسب اور اصل نسل کا پتہ چلتا ہو جتنی تفصیل کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ملتا ہے۔ اس لیے دنیا کے اکابر رجال میں حضورؐ کی شخصیت وہ واحد شخصیت ہے جو تاریخ کی پوری روشنی میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

دوم یہ کہ حضورؐ کے سوا کسی بڑے مذہبی یا دنیوی رہنما کے متعلق ہمیں اتنی تفصیل کے ساتھ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اپنے معاشرے میں اس کی جڑیں کتنی گہری اور کتنی دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اہل عرب کے لیے آپ کوئی غیر معروف شخص نہیں تھے، بلکہ جنوب سے شمال تک اور مشرق سے مغرب تک پورے عرب میں پھیلے ہوئے سینکڑوں قبائل کو معلوم تھا کہ آپ کس خاندان کے فرد ہیں اور اُس خاندان کے ساتھ اُن کا اپنا نسبی رشتہ کیا ہے۔

سوم یہ کہ قریش کے جتنے خاندان مکہ اور اس کے اطراف میں آباد تھے ان میں سے کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس سے آپ کا کسی نہ کسی طرح کی رشتہ داری کا تعلق نہ ہو۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس کا بیان ہے کہ:

لم یکن بطن من قریش الاولہ فیہ قرابۃ۔	قریش کے ہر خاندان سے آپ کا کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور تھا۔

قریش کا مکہ میں جمع ہونا اور کعبہ کی تولیت حاصل کرنا اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ مکہ پر جُرہُم کے تسلط کے بعد اولادِ اسماعیل عرب کے مختلف خطوں میں منتشر ہو گئی تھی۔ یہی کیفیت بنی خُزاعہ کی ایک شاخ غُبشان کی تولیتِ کعبہ کے دور میں بھی رہی۔ ۴۴۰ء کے لگ بھگ زمانے میں[1] قُصَی بن کِلاب کے ہاتھوں یہ صورت حال ختم ہوئی اور مکہ قریش کے قبضہ میں اور خانۂ کعبہ اس کی تولیت میں آ گیا۔

[1] ابن کثیر کی روایت ہے کہ کعب بن لُؤی (قصی کے پردادا) کی موت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے درمیان ۵۶۰ برس کا فصل ہے۔ اس لحاظ سے شاید غالب بن فہر حضرت مسیح کا ہمعصر تھا۔ ابن کثیر ہی نے سُہیلی اور دوسرے آئمہ کے حوالہ سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ مَعَد بن عدنان کا زمانہ وہ تھا جب بُخت نصر یروشلم کو تباہ کر کے اور یہودیوں کو قید کر کے بابل لے گیا۔ یہ ۵۸۶ء قبل مسیح کا واقعہ ہے۔

اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ قُصَیّ کا باپ کلاب بن مُرّہ جب مر گیا تو اس کی ماں فاطمہ بنت سعد، جو اَزدِ شَنُوْأَۃ میں سے تھی، بنی قُضاعہ کے ایک شخص ربیعہ بن حرام کے ساتھ نکاح کر کے شام چلی گئی اور وہاں اِس دوسرے شوہر سے اس کے ہاں ایک اور لڑکا رِزاح بن ربیعہ پیدا ہوا۔ جب قُصَیّ جوان ہوا تو ایک مرتبہ بنی قُضاعہ میں سے ایک شخص سے اس کی لڑائی ہو گئی اور اس نے قُصَیّ کو طعنہ دیا کہ "تو ہمارے ہاں پل کر ہم ہی پر غرّاتا ہے، اپنے لوگوں میں کیوں نہیں جاتا؟" اس پر قُصَیّ نے اپنی ماں سے پوچھا کہ میں کون ہوں؟ اس نے بتایا کہ تو کلاب کا بیٹا اور قبیلۂ قریش کا فرزند ہے اور تیری قوم بیت الحرام کے پاس شہر مکہ اور اس کے گرد و نواح میں رہتی ہے۔ تب قصی نے اصرار کیا کہ میں اپنے لوگوں میں جاؤں گا۔ چنانچہ جب حج کا زمانہ آیا تو وہ بنی قُضاعہ کے حاجیوں کے ساتھ مکہ پہنچ گیا۔ یہاں اس کا حقیقی بھائی زُہرہ، جو کلاب کی وفات کے وقت جوان تھا، پہلے سے آباد تھا۔ وہ اُسی کے پاس ٹھیر گیا اور اس نے حُلَیل بن حُبْشِیّہ خُزاعی سے (جو اُس وقت کعبہ کا متولی اور مکہ کا صاحبِ امر تھا) اس کی لڑکی حُبّیٰ کا رشتہ مانگا جسے اُس نے قُصَیّ کی شرافتِ نسبی اور شاندار شخصیت دیکھ کر بخوشی قبول کر لیا۔

اِس کے بعد کعبہ کی تولیت اور مکہ کی سرداری کس طرح اس کے قبضہ میں آئی، اس باب میں روایات مختلف ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ حُلیل نے خود وصیت کر دی تھی کہ اس کے بعد قُصَیّ ولایت کعبہ کا اہل ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ حُلَیل کے مرنے کے بعد قُصَیّ نے دعویٰ کیا کہ میں دوسروں سے بڑھ کر اِس منصب کا اہل ہوں، اور جب بنی خُزاعہ اور بنی بکر نے نہ مانا تو اس نے اپنے ماں جائے بھائی رِزاح اور بنی کنانہ اور قُضاعہ کو مدد کے لیے بلا لیا، اور مکہ کے اطراف میں قریش کے جو لوگ آباد تھے اُن کو بھی جمع کر لیا اور بزور خزاعہ اور بنی بکر کو مکہ سے نکال دیا۔ بعد میں جب فریقین نے یَعْمُر بن عوف کو پنچ بنایا تو اس نے فیصلہ دیا کہ خزاعہ کے مقابلہ میں قُصَیّ ولایتِ کعبہ کا زیادہ حقدار ہے کیونکہ وہ اور اُس کا خاندان قطعی اور صریح طور پر آلِ اسماعیل میں سے ہے۔

اس طرح جب قُصَیّ نے کعبہ کی تولیت اور مکہ کی سرداری حاصل کر لی تو اس نے فِہر کی ساری اولاد کو (جو قریش کہلاتی تھی) عرب کے مختلف حصوں سے مکہ میں جمع کر لیا اور مکہ کو ان کے درمیان بانٹ کر شہر کے ایک ایک حصہ میں ایک ایک خاندان کو آباد کر دیا۔ اسی بنا پر قریش اُسے مُجَمِّع (جمع کرنے والا) کہتے ہیں۔ چنانچہ حُذافہ بن غانم عَدَوِی کہتا ہے:

ابوکم قُصَیٌّ کان یُدعیٰ مجمِّعاً — بہ جمّع اللہ القبائلَ من فِہر

تمہارا باپ قُصَیّ مجمِّع کہا جاتا تھا۔ — اسی کے ذریعہ سے اللہ نے فِہر کے قبائل کو جمع کیا

مکہ کی شہری ریاست اور حج کا انتظام قُصَیّ کی اِنہی خدمات کی بنا پر اُس کو تمام قبائلِ قریش نے اپنا سردار مان لیا۔ قریش کے کسی گھرانے میں جو لڑکی بھی جوان ہوتی اُسے قمیص قُصَیّ کے گھر ہی میں پہنائی جاتی۔ جو نکاح بھی ہوتا قُصی کے گھر میں ہوتا۔ کوئی اہم معاملہ پیش آتا یا کسی قبیلے سے جنگ کی نوبت آتی تو اِسی گھر میں سب گھرانوں کے سردار مشورے کے لیے جمع ہوتے۔ اِسی وجہ سے یہ گھر دار النَّدوہ کہلاتا تھا۔ جنگ کے موقع پر قُصی ہی کی اولاد میں سے کسی کو علمبردار بنایا جاتا۔ اِس منصب کا نام اللّواء تھا۔ حج کے سارے انتظامات بھی قُصَی کے ہاتھ میں تھے۔ ان میں سے ایک کام السِّقایہ تھا، یعنی حاجیوں کو پانی پلانا۔ دوسرا الرِّفادہ تھا، یعنی حاجیوں کو کھانا کھلانے کا بندوبست جس کے لیے قریش کے سارے گھرانے چندہ اکٹھا کر کے قُصَیّ کو دیتے تھے اور وہ حج سے واپسی تک تمام اُن حاجیوں کے لیے کھانے کا انتظام کرتا تھا جو اپنے کھانے کا خود انتظام نہ کر سکتے۔ تیسرا الحِجابہ تھا، یعنی خانہ کعبہ کی کلید برداری۔

قُصَی اپنی زندگی میں مکہ کی ریاست کا بلا شرکتِ غیرے مالک رہا۔ جب اس کا آخر وقت آیا تو اس نے یہ دیکھ کر کہ اس کا بیٹا عبدِ مَناف پہلے ہی عرب میں ناموری حاصل کر چکا ہے اور اس کا شرف تسلیم کیا جانے لگا ہے، مکہ کی ریاست کے تمام مناصب (نَدوَہ، حِجابہ، سِقایہ، رِفادہ اور لِواء) اپنے دوسرے بیٹے عبدالدّار کو دیدیے۔ قُصَی کی وفات کے بعد ایک مدت تک اس کے فیصلے کا احترام کیا گیا لیکن پھر کسی وقت اس کی اولاد میں اِن مَناصب کی تقسیم پر جھگڑا ہو گیا، جس میں قریش کے کچھ گھرانے بنی عبدالدّار کے ساتھ اور کچھ بنی عبدِ مَناف کے ساتھ ہو گئے۔ قریب تھا کہ یہ جھگڑا طول کھینچ جاتا، لیکن خانہ جنگی تک نوبت پہنچنے سے پہلے آپس میں تصفیہ ہو گیا جس کے تحت حِجابہ، لِواء اور نَدوہ بنی عبدالدّار کے پاس رہے، اور سِقایہ اور رِفادہ بنی عبدمناف کو دیدیے گئے۔ آل عبدمَناف نے آپس کے مشورے سے یہ دونوں منصب ہاشم کو دیدیے۔

ہاشم ہاشم کا اصل نام عَمرو تھا۔ "ہاشِم" کا لقب اسے اُس وقت دیا گیا جب مکہ میں ایک مرتبہ سخت قحط پڑا، اور اس نے شام سے غلہ لا کر روٹیاں پکوائیں اور بہت سے اونٹ کٹوا کر سالن تیار کرایا اور روٹیوں کو اس میں چُور کر لوگوں کو اس کا ثرید (مالیدہ) کھلایا۔ ہَشْم کے معنی توڑنے اور کچلنے کے ہیں۔ روٹیاں توڑ کر سالن میں مالیدہ بنوانے کی وجہ سے اس کو ہاشم کہا جانے لگا۔ رِفادہ اور سِقایہ کا منصب ہاتھ میں آنے کے بعد ہاشم کا قاعدہ یہ تھا کہ جب حج کا زمانہ آتا تو وہ قریش کے لوگوں کو جمع کر کے کہتا "یہ اللہ کے پڑوسی اور اُس کے گھر کے لوگ اِس زمانے میں زیارت کے لیے تمہارے پاس آتے ہیں۔ یہ اللہ کے مہمان ہیں، اور سب سے زیادہ ضیافت کے حق دار اللہ ہی کے مہمان ہوتے ہیں۔ اللہ نے

تم کو یہ خصوصیت بخشی ہے اور اسی کی بدولت تمہیں عزت دی ہے اور تمہاری ایسی حفاظت کی ہے جیسی کوئی پڑوسی اپنے پڑوسی کی نہیں کرتا۔ لہٰذا اس کے مہمانوں اور زائروں کا اکرام کرو جو گرد آلود اور پراگندہ حال ہر دور دراز علاقے سے دبلی اونٹنیوں پر، جو سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہیں، آرہے ہیں۔ اُن کے کپڑے میلے ہو رہے ہیں۔ اُن میں جوئیں پڑ گئی ہیں۔ اُن کا زادِ راہ ختم ہو گیا ہے۔ لہٰذا ان کو کھانا کھلاؤ اور پانی پلاؤ"۔ اس پر قریش کے سارے خاندانوں سے چندہ آتا اور خود ہاشم زرِ کثیر اپنے پاس سے خرچ کرتا۔ پھر چمڑے کے بڑے بڑے حوضوں میں مکہ کے سارے کنوؤں سے (کیونکہ زمزم کو تو جُرہُم بند کر گئے تھے اور اس کا نشان تک باقی نہ تھا) پانی لا لا کر ان میں حاجیوں کے لیے بھرا جاتا۔ روٹیاں اور سالن پکا کر ان کا ثرید بنایا جاتا۔ روٹی اور دودھ کا ملیدا بھی بنایا جاتا۔ ستو اور کھجوریں وغیرہ فراہم کی جاتیں اور حاجیوں کے منیٰ سے رخصت ہونے تک اُن کی ضیافت کا سلسلہ جاری رہتا۔ اِسی چیز نے ہاشم کو عرب کے تمام قبائل میں مقبول بنا دیا تھا کیونکہ ان سب کو ہر سال حج میں اُس کی اِس فیاضانہ خدمت سے استفادے کا موقع ملتا تھا۔ (اضافہ از مولف)

قریش کی تجارت اور ان کی ترقی قریش کی وہ تجارت جس کا ذکر سورۂ قریش میں رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيۡفِ (گرمی اور جاڑے کے سفروں) کے نام سے اللہ کے ایک فضل کے طور پر کیا گیا ہے، اس کا خیال بھی سب سے پہلے ہاشم ہی کے ذہن میں پیدا ہوا۔ اُس نے اپنے تینوں بھائیوں، عبدِ شمس، مُطّلِب اور نوفل کو ساتھ ملا کر یہ منصوبہ بنایا کہ اُس بین الاقوامی تجارت میں حصہ لیا جائے جو عرب کے راستے بلادِ مشرق اور شام و مصر کے درمیان ہوتی تھی، اور ساتھ ساتھ اہلِ عرب کی ضروریات کا سامان بھی خرید کر لایا جائے تاکہ راستے کے قبائل اُن سے مال خریدیں، اور مکے کی منڈی میں اندرونِ ملک کے تُجّار خریداری کے لیے آنے لگیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایران کی ساسانی حکومت اُس بین الاقوامی تجارت پر اپنا تسلط قائم کر چکی تھی جو شمالی علاقوں اور خلیج فارس کے راستوں سے رومی سلطنت اور بلادِ مشرق کے درمیان ہوتی تھی۔ اِسی وجہ سے جنوبی عرب سے بحرِ احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ جو تجارتی راستہ شام و مصر کی طرف جاتا تھا اُس کا کاروبار بہت چمک اٹھا تھا۔ عرب کے دوسرے تجارتی قافلوں کی بہ نسبت قریش کو یہ سہولت حاصل تھی کہ راستے کے تمام قبائلی بیت اللہ کے خُدّام ہونے کی حیثیت سے ان کا احترام کرتے تھے۔ حج کے زمانے میں نہایت فیاضی کے ساتھ حاجیوں کی جو خدمت قریش کے لوگ کرتے تھے اس کی بنا پر سب اُن کے احسان مند تھے۔ انھیں اِس امر کا کوئی خطرہ نہ تھا کہ راستے میں کہیں ان کے قافلوں پر ڈاکہ مارا جائے گا۔ راستے کے قبائل اُن سے بھاری ٹیکس بھی وصول نہ کر سکتے تھے جو دوسرے قافلوں

سے طلب کیا جاتا تھا۔ ہاشم نے انہی تمام پہلوؤں کو دیکھ کر تجارت کی اسکیم بنائی اور اپنی اس سکیم میں اپنے تینوں بھائیوں کو شامل کیا۔ شام کے غسّانی بادشاہ سے ہاشم نے، حبش کے بادشاہ سے عبدِ شمس نے، یمنی امراء سے مُطّلب نے اور عراق و فارس کی حکومتوں سے نوفل نے تجارتی مراعات حاصل کیں[1]۔ اس طرح اِن لوگوں کی تجارت بڑی تیزی سے ترقی کرتی چلی گئی۔ اسی بنا پر یہ چاروں بھائی مُتَّجِرِین (تجارت پیشہ) کے نام سے مشہور ہو گئے، اور جو روابط انہوں نے گرد و پیش کے قبائل اور ریاستوں سے قائم کیے تھے اُن کی بنا پر اِن کو اَصْحاب الاِیْلاف بھی کہا جاتا تھا جس کے لفظی معنی "الفت پیدا کرنے والوں" کے ہیں۔

اِس کاروبار کی وجہ سے قریش کے لوگوں کو شام، مصر، عراق، ایران، یمن، اور حبش کے ممالک سے تعلقات کے وہ مواقع حاصل ہوئے، اور مختلف ملکوں کی ثقافت و تہذیب سے براہِ راست سابقہ پیش آنے کے باعث اُن کا معیارِ دانش و بینش اتنا بلند ہوتا چلا گیا کہ عرب کا کوئی دوسرا قبیلہ اُن کی ٹکر کا نہ رہا۔ مال و دولت کے اعتبار سے بھی وہ عرب میں سب پر فائق ہو گئے اور مکہ جزیرۃ العرب کا سب سے زیادہ اہم تجارتی مرکز بن گیا۔ ان بین الاقوامی تعلقات کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ عراق سے یہ لوگ وہ رسم الخط لے کر آئے جو بعد میں قرآن مجید لکھنے کے لیے استعمال ہوا۔ عرب کے کسی دوسرے قبیلے میں اتنے پڑھے لکھے لوگ نہ تھے جتنے قریش میں تھے۔ انہی وجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "قریش قادۃُ النّاسِ" "قریش لوگوں کے لیڈر ہیں" (مُسندِ احمد، مرویاتِ عمروؓ بن العاص)۔ اور حضرت علیؓ کی روایت بَیْہَقی میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

کان ھٰذا الامر فی حِمْیَرَ فَنَزَعَه اللہ منھم و جعلہ فی قریش۔	پہلے عرب کی سرداری قبیلۂ حِمْیَر والوں کو حاصل تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے اُن سے سلب کر کے قریش کو دے دی۔

قریش اسی طرح ترقی پر ترقی کرتے چلے جا رہے تھے کہ مکہ پر اَبرہہ کی چڑھائی کا واقعہ پیش آ گیا۔ اگر اُس وقت ابرہہ اِس شہرِ مقدس کو فتح کرنے اور کعبے کو ڈھا دینے میں کامیاب ہو جاتا تو عرب میں قریش ہی کی نہیں

---

[1] طبری کا بیان ہے کہ ہاشم نے شام اور غسّان اور روم کے بادشاہوں سے، عبدشمس نے نجاشی سے، نوفل نے شاہانِ فارس سے، اور مُطّلب نے شاہانِ حِمیَر سے تجارتی مراعات اور سفر میں حفاظت کے پروانے حاصل کیے (حاشیہ از مولف)

خود کعبہ کی دھاک بھی ختم ہو جاتی۔ زمانۂ جاہلیت کے عرب کا یہ عقیدہ متزلزل ہو جاتا کہ یہ گھر واقعی بیت اللہ ہے۔ قریش کو اس گھر کے خادم ہونے کی حیثیت سے جو احترام پورے ملک میں حاصل تھا وہ یک لخت ختم ہو جاتا۔ مکے تک حبشیوں کی پیش قدمی کے بعد رومی سلطنت آگے بڑھ کر شام اور مکہ کے درمیان کا تجارتی راستہ بھی اپنے قبضے میں لے لیتی۔ اور قریش اُس سے زیادہ خستہ حالی میں مبتلا ہو جاتے جس میں وہ قُصَی بن کلاب سے پہلے مبتلا تھے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا یہ کرشمہ دکھایا کہ پرندوں کے لشکروں نے سنگریزے مار مار کر ابرہہ کی لائی ہوئی ۶۰ ہزار حبشی فوج کو تباہ و برباد کر دیا، اور مکے سے یمن تک سارے راستے میں جگہ جگہ اس تباہ شدہ فوج کے آدمی گر گر کر مرتے چلے گئے تو کعبہ کے بیتُ اللہ ہونے پر تمام اہل عرب کا ایمان پہلے سے بدرجہا زیادہ مضبوط ہو گیا اور اس کے ساتھ قریش کی دھاک بھی ملک بھر میں پہلے سے زیادہ قائم ہو گئی۔ اب عربوں کو یقین ہو گیا کہ ان لوگوں پر اللہ کا فضلِ خاص ہے۔ وہ بے کھٹکے عرب کے ہر حصے میں جاتے اور اپنے تجارتی قافلے لے کر ہر علاقے سے گزرتے۔ کسی کی یہ جرأت نہ تھی کہ اُن کو چھیڑتا۔ انہیں چھیڑنا تو درکنار، اُن کی امان میں کوئی غیر قریشی بھی ہوتا تو اس سے کوئی تعرّض نہ کیا جاتا۔

(تفہیم القرآن۔ جلد ششم۔ دیباچہ سورۂ قریش)

عبدالمطلب بن ہاشم ہاشم اپنے تجارتی سفروں کے سلسلے میں اکثر شام جاتے ہوئے مدینے ٹھیرا کرتا تھا، اور وہاں قبیلۂ خزرج کی ایک عورت سے وہ پہلے ہی شادی کر چکا تھا جس سے اس کے دو بچے حَیَّہ (لڑکی) اور ابوصیفی (لڑکا) پیدا ہوئے تھے۔ ایک اور سفر میں اس نے خزرج ہی کے ایک خاندان بنی نجّار کی ایک عورت سَلمیٰ بنت عَمرو بن زید کو بازار میں ایک اونچے مقام پر بیٹھے دیکھا جو حکم دیتی جا رہی تھی کہ اس کے لیے کیا خریدا جائے اور اس کی طرف سے کیا بیچا جائے۔ ہاشم کو اس کے حسن و جمال اور اس کی شان و شوکت اور فراست و ذہانت نے بہت متاثر کیا اور اس سے شادی کی درخواست کی۔ وہ کسی سے اِس شرط کے بغیر شادی کے لیے تیار نہ تھی کہ وہ اپنی مرضی کی مختار ہوگی اور کسی شخص کو پسند نہ کرے گی تو علیحدگی اختیار کر لے گی۔ ہاشم نے اس کی شرط مان لی اور اس نے ہاشم کی خاندانی شرافت اور ذاتی وجاہت کو دیکھ کر اس کا پیغام قبول کر لیا۔ مدینے ہی میں دونوں کی شادی ہوئی اور یہیں اس خاتون کے بطن سے حضورؐ کے دادا عبدالمطلب تقریباً ۴۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ اسی سفر میں ہاشم جب غزہ پہنچا تو بیمار ہو گیا اور وہیں اس کی وفات ہوئی۔ اِس طرح عبدالمطلب جوانی کی عمر کے قریب پہنچنے تک اپنی ماں کے پاس مدینے ہی میں رہے۔ ہاشم نے مرتے وقت وصیت کی کہ اُس کے بعد اُس کا بھائی

مُطّلب اُس کی جگہ سِقایہ اور رِفادہ کا متولی ہوگا اور وہی اس کے اہل و عیال اور اس کی جائداد کی دیکھ بھال کرے گا۔ اُس وقت سے بنی ہاشم اور بنی المطّلب یک جان و دو قالب ہو گئے اور آخر تک رہے۔ اس کے برعکس بنی عبدِ شمس (جن میں سے بنی اُمیہ تھے) اور بنی نوفل ایک دوسرے کے حلیف بنے اور بعد تک رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد رسالت میں جب قریش کے سب قبیلوں نے آپ کا مقاطعہ کیا اور شعبِ ابی طالب میں آپ کو محصور کر لیا تو بنی ہاشم کے ساتھ بنی المطّلب بھی اِس محصوری میں آپ کے ساتھ شامل ہوئے، بخلاف اس کے بنی نوفل اور بنی عبد شمس نے مخالفین کا ساتھ دیا۔

عبد المطلب (جن کا اصل نام شَیْبَہ تھا اور اپنی خوبیوں کے باعث شَیْبَۃُ الحَمْد بھی کہلاتے تھے) مدینہ میں پرورش پا رہے تھے کہ ایک مرتبہ ثابت بن مُنْذِر (جو حضرت حسانؓ بن ثابت کا باپ تھا) مکے گیا اور مُطّلب سے ملا جس کے ساتھ اس کا پہلے سے میل جول تھا۔ دوران گفتگو میں اس نے کہا کہ تم کہیں اپنے بھتیجے شیبہ کو دیکھو تو تمہارا جی خوش ہو جائے۔ بڑا شاندار، پُرہیبت اور خوبرو جوان اٹھا ہے۔ یہ حالات سن کر مُطّلب بے تاب ہو گیا اور جا کر بھتیجے کو اپنے ساتھ اونٹ پر بٹھا کر لے آیا۔ قریش کے لوگوں نے اس نوجوان لڑکے کو مُطّلب کے ساتھ آتے دیکھا تو کہنے لگے یہ عبد المطلب ہے۔ مطلب نے لوگوں کو ڈانٹا بھی کہ یہ میرے بھائی ہاشم کا لڑکا شَیبہ ہے، میرا غلام نہیں ہے، مگر "عبد المطلب" کا نام کچھ ایسا مشہور ہوا کہ اصلی نام اس کے نیچے دب کر رہ گیا۔ کچھ مدت کے بعد مطلب ایک تجارتی سفر کے سلسلے میں یمن گیا اور وہیں مر گیا۔ عبد المطلب اُس کے جانشین ہوئے اور سِقایہ و رِفادہ کے دونوں منصب اُن کو مل گئے۔ ابن سعد اُن کی تعریف میں کہتا ہے کہ "وہ قریش میں سب سے زیادہ خوبصورت، سب سے زیادہ تنومند، سب سے زیادہ سنجیدہ و بردبار، سب سے زیادہ سخی، اور سب سے زیادہ اُن برائیوں سے دور تھے جو مردوں کو بگاڑنے والی ہوتی ہیں۔" ابن ہشام کا قول ہے کہ "ان کو اپنی قوم میں عزت و شرف کا وہ مرتبہ حاصل ہوا جس تک ان کے آباء میں سے کوئی نہ پہنچا تھا۔ ان کی قوم ان سے محبت کرتی تھی اور لوگوں میں وہ بڑی منزلت رکھتے تھے۔"

طَبَری نے لکھا ہے کہ عبد المطلب کے چچا نوفل نے ہاشم کے چھوڑے ہوئے ترکہ میں سے ایک حصہ غصب کر لیا تھا۔ عبد المطلب نے پہلے اپنی ددھیال والوں سے مدد مانگی، مگر انھوں نے چچا اور بھتیجے کے جھگڑے میں دخل دینے سے انکار کر دیا۔ پھر عبد المطلب نے اپنی ننھیال (مدینہ کے بنی عَدِی بن نجّار) کو مدد کے لیے بلایا۔ اس پر ان کا ماموں ۸۰ آدمی لے کر مکہ پہنچ گیا اور اس نے زبردستی نوفل سے اپنے بھانجے کا حق دلوایا۔

اس کے بعد نوفل بھی بنی ہاشم کے خلاف بنی عبد شمس سے مل گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد رسالت تک بنی نوفل اُسی جتھے میں شامل رہے جو بنی ہاشم کا مخالف اور بنی عبدشمس کا ساتھی تھا۔ عبدالمطلب نے جب یہ دیکھا کہ بنی نوفل ان کے مخالف جتھے سے جا ملے ہیں تو انہوں نے خزاعہ کے سرداروں سے بات چیت کی اور ان کے ساتھ محالفت (اتحاد اور امداد باہمی) کا معاہدہ کر لیا اور کعبہ میں جا کر انہوں نے باقاعدہ معاہدہ کی تحریر لکھی۔ ابن سعد کا بیان اس سے ذرا مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ بنی خزاعہ نے عبدالمطلب سے خود درخواست کر کے باہمی دوستی و معاونت کا معاہدہ کیا تھا۔ اس معاہدہ میں بنی المطلب اور بنی ہاشم، دونوں خاندان شریک ہوئے اور بنی عبد شمس اور بنی نوفل اس سے الگ رہے۔ یہ معاہدہ دارالندوہ میں لکھا گیا اور کعبہ میں آویزاں کر دیا گیا۔ اس کے مطابق عبدالمطلب نے اپنی اولاد کو وصیت کی تھی کہ بنی خزاعہ کے ساتھ ہمیشہ دوستی نباہنا۔ یہ اسی کا اثر تھا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب شرائطِ معاہدہ میں سے ایک شرط یہ طے ہوئی کہ قبائلِ عرب میں سے جو چاہے فریقین میں سے کسی ایک کے ساتھ شریک ہو جائے تو خزاعہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہونے کا فیصلہ کیا۔

عبدالمطلب کا زمزم کو از سرِ نو برآمد کرنا یہ فخر بھی جناب عبدالمطلب ہی کو حاصل ہوا کہ زمزم، جسے جرہم بند کر کے اس کا نشان تک مٹا گئے تھے، ان کے ہاتھوں از سرِ نو برآمد ہوا۔ محمد بن اسحاق نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ خواب میں جناب عبدالمطلب کو زمزم کا مقام بتایا گیا اور انہیں ہدایت کی گئی کہ اس جگہ کو کھود کر یہ مقدس کنواں برآمد کر لیں۔ اس وقت اُن کا کوئی بیٹا حارث کے سوا نہ تھا۔ اسی کو لے کر وہ کدال پھاوڑا لیے ہوئے وہاں پہنچے اور کھدائی شروع کر دی۔ جب پانی نمودار ہوا تو عبدالمطلب نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اس سے قریش کے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ زمزم نکل آیا ہے۔ وہ سب اکٹھے ہو گئے اور کہنے لگے کہ "اے عبدالمطلب یہ تو ہمارے باپ اسماعیل کا کنواں ہے اور اس میں ہمارا بھی حق ہے، ہمیں اس میں اپنے ساتھ شریک کرو۔" انہوں نے جواب دیا "میں یہ نہیں کر سکتا۔ یہ خاص طور پر مجھے دیا گیا ہے، تم میں سے کسی کو نہیں دیا گیا۔" وہ جھگڑے پر آمادہ ہو گئے۔ عبدالمطلب نے کہا "اچھا تو کسی کو حَکَم بنا لو۔" انہوں نے بنی سعد بن ہُذَیم کی کاہنہ کا نام تجویز کیا جو شام کے بالائی علاقوں میں رہتی تھی۔ عبدالمطلب نے یہ بات مان لی اور اپنے چند ساتھیوں کو لے کر وہ بنی امیہ اور قبائلِ قریش میں سے ہر قبیلے کے کچھ لوگوں کے ساتھ شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک بے آب و گیاہ بیابان آیا جہاں عبدالمطلب اور ان کے ساتھیوں کا پانی ختم ہو گیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ ہم پیاس سے مر جائیں گے۔ انہوں نے اپنے ہم سفر دوسرے اہلِ قریش سے پانی مانگا۔ مگر انہوں نے یہ کہہ کر

انکار کر دیا کہ یہاں پانی کا دور دور کہیں نام و نشان نہیں ہے، ہم اگر اپنے پانی میں تمہیں شریک کریں تو ہم بھی اسی ہلاکت میں مبتلا ہو جائیں گے جس کا تمہیں خطرہ ہے۔ آخر کار عبدالمطلب نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ابھی ہمارے ہاتھ پاؤں میں کچھ جان ہے۔ آؤ، ہم میں سے ہر ایک اپنے لیے ایک گڑھا کھودے اور جو جو مرتا جائے اس کو اسی گڑھے میں دفن کیا جاتا رہے۔ چنانچہ ہر ایک نے گڑھا کھود لیا اور سب موت کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ پھر عبدالمطلب نے ساتھیوں سے کہا کہ ہم نے اپنے آپ کو یونہی موت کے حوالے کر دیا۔ آؤ ہمت کر کے چلیں، شاید کہیں ہمیں پانی مل جائے۔ یہ کہہ کر سب کوچ کے لیے تیار ہو گئے۔ مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جب عبدالمطلب نے اپنے اونٹ کو اٹھایا اور اس کا پاؤں زمین پر پڑا تو یکایک اس کے نیچے سے میٹھے پانی کا ایک چشمہ نکل آیا۔ اس پر عبدالمطلب اور ان کے ساتھیوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور اتر کر خوب پانی پیا اور اپنے مشکیزے پانی سے بھر لیے۔ پھر عبدالمطلب نے ان دوسرے اہل قریش کو، جنھوں نے پانی دینے سے انکار کیا تھا، پکارا اور کہا آؤ، اللہ نے ہمیں پانی دیدیا ہے، تم بھی پیو اور پانی بھر لو۔ چنانچہ وہ آئے، سب پانی سے سیراب ہوئے اور پھر کہا کہ "اے عبدالمطلب، خدا ہی نے ہمارے خلاف تمہارے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ خدا کی قسم اب ہم زمزم کے معاملہ میں تم سے جھگڑا نہ کریں گے۔ جس خدا نے تمہیں اس بیابان میں پانی دیا ہے اسی خدا نے زمزم بھی تمہیں عطا کیا ہے۔ اب اپنے پانی کی طرف بخیر و خوبی واپس چلو"۔ اس طرح سب اس کاہنہ کے پاس جانے کے بجائے مکے واپس ہو گئے۔

یہ سقایہ کا منصب، جس میں اب سب سے اہم زمزم کی سقایت تھی، زندگی بھر عبدالمطلب کے پاس رہا۔ ان کے بعد یہ ان کے بیٹے ابوطالب کو ملا۔ مگر ابوطالب اپنی فیاضی کے باعث اپنی مالی استطاعت سے بہت بڑھ کر حاجیوں کو پانی، شربت، دودھ وغیرہ پلانے میں خرچ کرنے لگے، جس کی وجہ سے انہیں کئی مرتبہ اپنے بھائی عباس سے قرض لینا پڑا اور اسے ادا نہ کر سکے۔ آخر کار حضرت عباس نے شرط لگائی کہ اب اگر آپ ادا نہ کر سکیں گے تو سقایت کا منصب آپ کو میرے لیے چھوڑ دینا ہوگا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ سقایت حضرت عباس کو مل گئی۔ یہ زمانۂ قبل اسلام کی بات ہے۔ زمانۂ اسلام میں بھی یہ منصب بنی عباس ہی میں رہا۔

عبداللہ بن عبدالمطلب محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ زمزم کی کھدائی کے وقت جب عبدالمطلب نے دیکھا کہ ان کے ساتھ صرف ان کا ایک بیٹا ہے اور قریش سارے گھر کر آ گئے ہیں، تو انہوں نے نذر مانی کہ اللہ مجھے دس بیٹے عطا کرے جو میری حمایت کے لیے کھڑے ہو سکیں، تو ان میں سے ایک کو کعبہ کے پاس اللہ کی راہ میں قربان کر دوں گا۔ اللہ نے ان کی یہ دعا پوری کی اور دس بیٹے ان کو دیدیے اور وہ جوانی کی عمر کو پہنچ گئے۔ آخر کار ایک

روز عبدالمطلب نے سب کو جمع کیا اور اپنی نذر کا اُن سے ذکر کیا۔ سب نے کہا اللہ سے جو نذر آپ نے مانی ہے اسے پورا کیجیے۔ اس پر عبدالمطلب سب بیٹوں کو لے کر کعبہ میں ہُبل نامی بت کے پاس گئے جہاں فال نکالی جاتی تھی، اور فال اِس بات کے لیے نکلوائی کہ ان دس میں سے کس بیٹے کو قربان کریں۔ اس میں نام جناب عبداللہ کا نکلا جو عبدالمطلب کے سب سے خوبصورت اور باپ کو سب سے زیادہ پیارے بیٹے تھے۔ عبدالمطلب بلا تکلف عبداللہ کا ہاتھ پکڑ کر اور چھری لے کر اساف و نائلہ کی طرف لے چلے تاکہ وہاں ان کو ذبح کر دیں۔ قریش کے لوگ یہ دیکھ کر اپنی مجلسوں سے دوڑ پڑے اور کہنے لگے "عبدالمطلب، یہ کیا کرتے ہو، اگر تم نے ایسا کیا تو آئے دن کوئی نہ کوئی اپنے بیٹے کو لا کر ذبح کرنے لگے گا۔ چلو، حجاز کی فلاں عرّافہ (سیانی) کے پاس چلو اور وہ جو کہے وہی کرو، ممکن ہے کہ وہ اِس مشکل کا کوئی حل بتا دے"۔ اس تجویز کے مطابق یہ لوگ مدینے پہنچے اور وہاں معلوم ہوا کہ وہ عرّافہ خیبر میں ہے۔ وہاں جا کر اس سے ماجرا بیان کیا۔ اس نے کہا تمہارے ہاں آدمی کی دِیت کیا ہوتی ہے؟ لوگوں نے کہا ۱۰ اونٹ۔ وہ بولی واپس جاؤ اور اب فال اِس بات پر نکالو کہ عبداللہ کو قربان کیا جائے یا دس اونٹوں کو؟ اگر پھر لڑکے کے نام کی فال نکلے تو دس اونٹ اور بڑھاؤ اور پھر فال نکالو۔ اس طرح دس دس اونٹ بڑھا بڑھا کر فال نکالتے چلے جاؤ۔ جب اونٹوں پر فال نکل آئے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تمہارا رب بیٹے کے بجائے اِتنے اونٹوں کی قربانی پر راضی ہے۔ عرّافہ کی یہ بات قبول کر کے سب مکّے پلٹے اور فال نکالنی شروع کی۔ ۱۰۔ ۲۰۔ ۳۰ حتیٰ کہ ۹۰ تک فال عبداللہ ہی کے نام کی نکلتی رہی۔ آخر ۱۰۰ اونٹ پر پہنچ کر فال اونٹوں پر نکلی۔ چنانچہ ۱۰۰ اونٹ ذبح کیے گئے اور لوگوں کو اذنِ عام دے دیا گیا کہ جو جتنا گوشت چاہے لے لے۔

اس طرح ایک مرتبہ پھر آلِ ابراہیمؑ میں قربانی کا وہ واقعہ دُہرایا گیا جو مکہ میں اِس مبارک خاندان کی آبادی کے آغاز کے موقع پر پیش آیا تھا۔ اگرچہ روح اور معنی کے اعتبار سے دونوں واقعات میں بڑا فرق ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے کارخانے کی حکمتیں عجیب ہیں۔ پہلے اِس خاندان کے اُس فردِ اول کی قربانی کسی اور طرح مانگی گئی تھی جسے عرب میں دینِ اسلام کی دعوت کا آغاز کرنا تھا۔ اب اُس آخری نبی، صلی اللہ علیہ وسلم، کے والد کی قربانی کسی اور طرح مانگی گئی جسے تمام عالمِ انسانی میں اُسی دعوت کو پھیلانا تھا۔ پہلی قربانی کا فدیہ ایک مینڈھا تھا، اور دوسری کا فدیہ ۱۰۰ اونٹ۔

جناب عبداللہ کی شادی جناب عبداللہ ۲۵ سال کے تھے جب ان کے والد نے ان کی شادی بنی زہرہ بن کلاب

کی ایک خاتون آمنہ بنت وہب بن عبد مناف سے کر دی، جو اپنی قوم کی بہترین لڑکیوں میں شمار ہوتی تھیں۔ چند مہینے کی ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد، جب کہ بی بی آمنہ حاملہ تھیں، وہ ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ فلسطین کے شہر غزہ گئے۔ وہاں سے پلٹ کر جب مدینہ پہنچے تو بیمار ہو گئے۔ ساتھیوں سے کہا کہ تم مکہ واپس جاؤ اور میں اپنی دادی کے خاندان بنی عدی بن نجار میں ٹھیرتا ہوں۔ ایک مہینہ وہاں ٹھیرے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا اور دار النابغہ میں دفن کر دیے گئے۔ ساتھیوں نے مکہ پہنچ کر جب عبد المطلب کو ان کی بیماری کا حال سنایا تو انھوں نے فوراً اپنے بڑے بیٹے حارث کو مدینے بھیجا۔ مگر اس کے پہنچنے سے پہلے جناب عبداللہ کا انتقال ہو چکا تھا۔

یہ صحیح ترین روایت ہے جسے عموماً اہل علم نے تسلیم کیا ہے۔ ورنہ کسی روایت میں یہ ہے کہ ان کا انتقال اُس وقت ہوا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۲۸ مہینے کے تھے۔ کسی میں سات مہینے، اور کسی میں دو مہینے بھی بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن معتبر اور مسلّم یہی ہے کہ حضورؐ ابھی بطن مادر ہی میں تھے کہ آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا۔ اسی چیز کی طرف قرآن مجید میں اشارہ کیا گیا ہے کہ:

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ٥

"اے نبی، کیا ہم نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانا فراہم کیا؟"

(اضافہ از مولف)

اسلام میں سزائے اِرتداد

(از عبد الحمید صدیقی)

حال ہی میں پاکستان کے سابق چیف جسٹس جناب ایس اے رحمان صاحب کی ایک کتاب (PUNISHMENT OF APOSTASY IN ISLAM) یعنی "اسلام میں سزائے ارتداد" منظرِ عام پر آئی ہے۔ کتاب کو ادارہ ثقافت اسلامیہ نے شائع کیا ہے۔ فاضل مصنف نے کتاب کے تعارف میں بیان کیا ہے کہ پاکستان میں جو غیر مسلم آباد ہیں وہ نہ ذمی ہیں نہ مستامن بلکہ ان کی حیثیت معاہدین کی سی ہے جنہیں بانی پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح نے اس امر کی ضمانت دی تھی کہ مسلم اکثریت کی طرح بالکل مساوی سطح پر ان کے بنیادی حقوق کی بھی حفاظت کی جائے گی۔ آگے چل کر موصوف رقم طراز ہیں "کہ پاکستان جو ملی جلی آبادی کا ملک ہے اِس میں باہمی ہم آہنگی کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ آزادیٔ ضمیر، اظہار رائے، اپنے مذہب کی اشاعت و تبلیغ اور اپنے اپنے مذہبی رسوم و رواج کا تحفظ دنیائے جدید میں اخلاق و قانون کے مطابق، ہر قوم کا مسلّم و مقدس حق ہے۔ مرتد کا معاملہ خصوصاً جب وہ اکثریتی آبادی سے متعلق ہو۔ باہمی تعلقات میں ایک اچھے اور با اصول مذہب کے لیے آزمائش کی حیثیت رکھتا ہے۔ بدقسمتی سے ہماری فقہی کتب میں قرآن و سنتِ معتبرہ کی روشنی میں اس مسئلہ کا تجزیاتی مطالعہ نہیں کیا گیا اور فقہائے متقدمین کے دماغوں میں محض ارتداد اور ریاست سے بغاوت و غداری پر مشتمل ارتداد کے مابین کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ بس چپکے سے یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اسلام سے روگردانی کرنے والا ہر شخص سزائے موت کا مستوجب ہے جیسا کہ اسلام کا کوئی باغی اور محارب۔ اجتماعی و سیاسی میدان میں یہ نظریہ بڑے دوررس ردِ عمل کا حامل ہو سکتا ہے۔ اور ان ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں اس کے نتیجے میں جوابی قانون سازی کی جا سکتی ہے اور بالآخر قانون کے دائرے میں لڑی جانے والی یہ جنگ اسلامی تبلیغی سرگرمیوں کے خاتمہ کا سبب بن سکتی ہے۔" ص۲-۳

یہ اور اسی طرح کے دوسرے احساسات نے فاضل مصنف کو اس موضوع پر قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے اور آپ نے پاکستان کی نازک۔ کے عین اُس لمحہ میں جب کہ دستور زیرِ تشکیل تھا قوم کے دستور ساز ادارے کو یہ

سمجھانے کی کوشش کی کہ اسلام میں محض ارتداد کی کوئی سزا مقرر نہیں۔ قرونِ اُولیٰ میں جس سزائے قتل کا ذکر ملتا ہے وہ فساد فی الارض یا ریاست سے بغاوت کی سزا تھی جسے مسلمانوں نے غلطی سے یا مناسب غور و فکر کیے بغیر ارتداد کی سزا سمجھ لیا۔

فاضل مصنف نے زیرِ نظر تالیف میں سب سے پہلے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآنِ پاک میں ارتداد کی سزا کہیں قتل بیان نہیں کی گئی۔ دوسرے باب میں انھوں نے اس نقطۂ نظر سے سنت کا جائزہ لیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جن احادیث میں ارتداد کی سزا قتل بیان ہوئی ہے یا تو اُن احادیث کے راویوں میں سے بعض کاذب اور مُتّہم ہیں لہٰذا استدلال کے قابل نہیں یا راویوں نے محض الفاظ نقل کر دیے ہیں اور اُن کے پس منظر کو سمجھنے میں ناکام رہے ہیں۔ تیسرے باب میں خلافتِ راشدہ کے امثال و نظائر سے بحث کی ہے۔ اور چوتھے باب میں فقہاء کے اقوال و آراء سے۔ جیسا کہ ہم پہلے خود مصنف کے حوالہ سے درج کر چکے ہیں اس پوری کتاب میں انھوں نے جس نقطۂ نظر کی ترجمانی کی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام میں محض ارتداد کی سزا قتل نہیں ہے اور اگر ارتداد کی سزا قتل مان لی جائے تو اس سے ایک تو انسان کی آزادئ ضمیر متاثر ہوتی ہے دوسرے دنیا میں انسان کی آزمائش کا مقصد فوت ہو جاتا ہے کیونکہ اس طرح اسلام سے منحرف ہو جانے کی خواہش رکھنے والا ایک شخص قتل کے ڈر سے انحراف نہیں کر سکے گا اور دامنِ اسلام سے وابستہ رہے گا اور یہ جبر و اکراہ پر مبنی وابستگی اسلام کی عطا کردہ آزادئ انتخاب کے منافی ہے۔

فاضل مصنف کی "محققانہ تصنیف" کے مندرجات کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے ہم دو تین باتوں کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔

پہلی بات جو اس کتاب کے مطالعہ سے کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پس منظر میں اسلام کا وہی محدود تصور کارفرما ہے جس کا مغرب کی یلغار کے بعد بڑے زور و شور سے پرچار کیا جا رہا ہے۔ اس تصور کے تحت اسلام محض چند عقائد کا مجموعہ ہے جن کا عملی زندگی سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں۔ اس بناء پر ہر شخص کو یہ اختیار ہے کہ وہ ان عقائد کو اپنی مرضی سے جب چاہے اختیار کرے اور جب چاہے ترک کر دے۔ ان کے ترک و اختیار سے معاشرتی ڈھانچے، نظامِ مملکت اور نظامِ معیشت پر قطعاً کوئی اثر نہ پڑے۔ بنا بریں لوگوں کو تبدیلئ مذہب کی عام اجازت ہو اور اس اجازت کو آزادئ ضمیر سمجھا جائے۔ مذہب کا یہ تصور چونکہ مسیحی مشنریوں کے مقاصد کی تکمیل میں ممد و معاون تھا اس لیے مغربی سامراج نے جس جگہ بھی اپنا

تسلط قائم کیا وہاں مذہب کے اس محدود تصور کی خوب تبلیغ کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمیں ارتداد کی سزا قتل ایک انتہائی سفاکانہ اور انسانی ضمیر پر ایک ناروا قدغن دکھائی دیتی ہے درآنحالیکہ تمام آئمہ اور فقہاء اس بارے میں متفق و متحد ہیں کہ جو شخص اسلام لانے کے بعد دینِ حق کو چھوڑ دیتا ہے وہ واجب القتل ہے۔ اگر اس طرزِ فکر کے حامی اسلامی عقائد اور مسلم معاشرے کے مابین جو گہرا ربط ہے اسے نگاہ میں رکھتے اور یہ سوچتے کہ دینِ حق کو قبول کرنے کے بعد چھوڑ دینے سے اس معاشرے کی چولیں کس طرح ہل جاتی ہیں تو وہ کبھی ارتداد کی سزا کو سفاکانہ نہ کہتے۔

دوسری بات جو اس کتاب کے آغاز سے لے کر اختتام تک قاری کے ذہن میں کھٹکتی ہے وہ دین میں سنتِ رسول کے مقام و مرتبہ سے متعلق ہے۔ فاضل مصنف نے سنت کے بارے میں قریب قریب وہی موقف اختیار کیا ہے جو "بعض روشن خیال" آج کل اختیار کیے ہوئے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے قرآن کا نام لے کر سنت کی حیثیت کو گرایا جائے۔ اور عوام کو یہ تاثر دیا جائے کہ جو چیزیں سنت میں موجود ہیں مگر ان تجدد پسندوں کے نزدیک ان کی تائید میں قرانِ مجید خاموش ہے انہیں دین میں کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ سنت میں جو احکام موجود ہیں ان کی حیثیت تو اُن وقتی اور ہنگامی فرامین اور فیصلوں کی تھی جو حضور سرورِ کائنات نے اُس وقت کے مخصوص حالات میں صادر فرمائے۔ اس لیے وہ دین میں کسی مستقل قدر و قیمت کے حامل نہیں ہو سکتے۔ سنت سے استدلال کرتے ہوئے بھی فاضل مصنف نے وہی طریق کار اختیار کیا ہے جو عام طور پر متجددین کرتے ہیں کہ جہاں کوئی چیز اپنے موقف کی تائید میں ملی وہاں تو کسی ضعیف سے ضعیف روایت سے بھی اپنے موقف کو مضبوط بنانے کی کوشش کی اور جہاں کوئی چیز اپنے موقف کے خلاف پائی وہاں صحیح سے صحیح حدیث میں بھی کوئی نہ کوئی سقم نکال کر اسے رد کر دیا۔

تیسری بات جو کتاب کا مطالعہ کرتے وقت خاص طور پر محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں تحقیق کا وہی انداز اختیار کیا گیا ہے جو دنیائے مغرب میں "ریسرچ" کے نام سے اس وقت رائج ہے کہ پہلے ایک خیال کو ذہن میں بٹھا لیا جائے اور پھر اسے صحیح ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا جائے۔ اور اس کام کے لیے جہاں ضرورت پڑے حقائق کو بلا تکلف نظر انداز یا مسخ کر دیا جائے۔

ان ابتدائی معروضات کے بعد اب ہم فاضل مصنف کے دلائل کا جائزہ لیتے ہیں:

آیاتِ قرآن سے استدلال فاضل مصنف نے شروع میں:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۔
فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۔
وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۔
قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۔
مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۔ اور
لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۔ اور اسی مفہوم کی

دوسری آیات درج کر کے یہ بنیادی اصول اخذ کیا ہے کہ قرآن اُن لوگوں کے لیے ـ جو صداقت کی روشنی سے محروم ہوں یا جو اسلام کی اطاعت و فرمانبرداری کا قلادہ اتار پھینکنا چاہیں ـ آزادی و رواداری کا ماحول پیدا کرنا چاہتا ہے اُن کے نزدیک قرآن اچھی زندگی کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے لیکن انسانی عظمت و آزادی کو کچل کر اور دبا کر نہیں ۔

لیکن ہم عرض کریں گے کہ مندرجہ بالا آیات تصویر کا صرف ایک رخ پیش کرتی ہیں ـ یعنی دنیائے دارالعمل میں ہر انسان کو صحیح و غلط کے انتخاب کی آزادی ہے لیکن کیا یہ آزادی لامحدود ہے ؟ اور جس صورت میں بھی ظہور کرنا چاہے وہ قرآن کے نزدیک گوارا اور قابلِ قبول ہے ؟ قرآن ہی کی درج ذیل آیات کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہو جائے گا کہ ایسا ہرگز نہیں ۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۔
(آل عمران : ۸۵)

اور جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرنا چاہے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ
(البقرہ : ۱۹۳)

اور تم ان سے لڑائی کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لیے ہو جائے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ

وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ

كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (التوبۃ: ۳۳)

اُسے پوری جنسِ دین پر غالب کر دے اگرچہ مشرکوں کو یہ ناگوار ہی گزرے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (التوبۃ: ۷۳)

اے نبی کفار اور منافقین کے ساتھ بھرپور جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (الفرقان: ۵۲)

پس اے نبی کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ جہاد کبیر کرو۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔ (آل عمران: ۱۱۰)

تم وہ بہترین امت ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے مامور کیا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو، منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

ان آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اسلام کے سوا کوئی دین قبول نہیں نہ شروع سے ہی کسی کا کافر ہونا قبول ہے اور نہ اسلام اختیار کرنے کے بعد کافر ہو جانا۔ دوسری آیت میں فرمایا کہ کفار سے لڑائی کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ فتنہ کیا ہے؟ کفار کو مسلمانوں کا قبولِ اسلام ہی تو کھلتا تھا۔ اگر مسلمان دوبارہ کفر کی طرف پلٹ جاتے تو کافروں کو ان سے کوئی شکایت باقی نہ رہتی۔ آیت پاک میں اسی رجوع الی الکفر کو فتنہ قرار دیا گیا ہے۔ کافروں کو مسلمانوں کا عروج اور اسلام کی بالادستی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اور وہ دوبارہ کفر کی سربلندی کے لیے کوشاں تھے۔ قرآن سربلندئ کفر کے لیے کوشش کو فتنہ قرار دے کر اس کے مکمل سدِباب کا حکم دے رہا ہے۔ تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے رسول کا مقصدِ بعثت بیان فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول کو تمام ادیان پر دینِ اسلام کو غالب کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ بعد کی آیات میں کفار و منافقین کے ساتھ جہاد کبیر کرنے اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا حکم دیا ہے نیز امتِ مسلمہ کو یہ تعلیم بھی دی ہے کہ دنیا کو منکر سے باز رکھو۔

یہاں ہم فاضل مصنف سے یہ پوچھتے ہیں کہ آزادئ ضمیر اور عظمتِ انسانی کی بات بجائے خود درست ہی سہی لیکن یہ جو فرمایا جا رہا ہے کہ دینِ اسلام کے سوا کوئی دین قبول نہیں کیا جائے گا تو کیا یہ اس لیے فرمایا جا رہا

ہے کہ آپ شوق سے مرتد ہوا کریں ہم آپ کا ارتداد قبول کر لیں گے پھر یہ بھی سوچیے کہ "قبول نہیں کیا جائے گا" کا جملہ سزا، جزا یا رواداری میں سے کس کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ جب تک فتنہ کا مکمل سدِ باب نہ ہو جائے جہاد و قتال جاری رکھو۔ یہاں فتنہ سے مراد کیا چیز ہے؟ کفار اگر مسلمانوں سے لڑائی کرتے تھے تو اس کا سبب کیا تھا۔ یہاں فتنہ سے مراد "کفار کا مسلمانوں سے لڑنا" بہر حال نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ فتنہ قتل سے زیادہ سخت اور بڑی بُرائی ہے اور لازماً وہ بڑی برائی قتل کے علاوہ کوئی اور ہے۔ مگر فاضل مصنف ہیں کہ اس برائی (رجوع الی الکفر) کو نہایت ہلکی اور معمولی چیز قرار دے رہے ہیں۔ مزید براں قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت غلبۂ دین بیان کرتا ہے۔ غور کیجیے کہ کیا غلبۂ دین کا عظیم الشان کام ہر کافر و مرتد کو مکمل آزادئ ضمیر دے کر اور ان کی سرگرمیوں کو برداشت کرتے ہوئے انجام پا سکتا ہے۔ اور اگر یہ کام کفار و مرتدین اور مشرکین کو ادنیٰ تکلیف پہنچے بغیر ہو سکتا تو قرآن وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ اور وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ کا اضافہ نہ کرتا۔ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ اور وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ میں واضح طور پر اللہ تعالیٰ نے کفار و منافقین سے جہاد و قتال کرنے اور ان کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ فاضل مصنف صاحب کہتے ہیں کہ جہاد و قتال صرف ان کفار و منافقین سے کیا جائے گا جو مسلمانوں سے لڑائی کریں یعنی جو (ACTIVE AND WARRING ENEMIES) ہوں۔ ٹھیک ہے ان سے لڑائی کی جائے گی مگر جو کفار و منافق عملاً برسرِ پیکار نہ ہوں انہیں کھلی چھٹی بھی نہیں دی جائے گی۔ قرآن کا یہ حکم جہاد و قتال مطلق ہے لہٰذا یا تو صاحبِ تصنیف یہ ثابت کریں کہ ہر کافر اور منافق (ACTVIE ENEMY) تھا اور یہ ثبوت قرآن سے ملنا چاہیے یا پھر انہیں تسلیم کرنا چاہیے کہ مذکورہ بالا آیات کے بعد اسلامی معاشرہ میں غیر مسلموں اور مرتدوں کو وہ نام نہاد آزادی (FREEDOM) نہیں دی جا سکتی کہ جس کے نتیجے میں اسلامی معاشرہ زیر و زبر ہو جائے۔ اور دین بازیچہ اطفال بن جائے۔ آخری آیت میں اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کی ایک صفت نہی عن المنکر بھی بیان فرمائی ہے۔ فاضل مصنف جو دورِ جدید میں اسلام کو بڑا فراخ دل اور روادار مذہب ثابت کرنا چاہتے ہیں اور مرتدوں اور غیر مسلموں کے لیے مکمل آزادئ ضمیر کے ترجمان ہیں کیا اس امر کی وضاحت کرنا پسند کریں گے کہ اس آیت میں لوگوں کو منکرات سے روکنے کا جو اختیار امتِ مسلمہ کو دیا گیا ہے اس اختیار سے لوگوں کی آزادی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ نیز

گئے ہاتھوں یہ بھی بتا دیا جائے کہ ارتداد بھی منکرات میں داخل ہے یا نہیں۔

مذکورہ بالا آیات سے تصویر کا جو دوسرا رخ سامنے آتا ہے اس سے صاحب تصنیف کا اخذ کردہ یہ نتیجہ ـــ کہ جو لوگ صداقت کی روشنی سے محروم رہنا چاہیں یا جو اسلام کی اطاعت و فرمانبرداری کا قلادہ گلے میں ڈالنے کے بعد اتار کر پھینک دیں قرآن اُن کے لیے آزادی و برداشت کا ماحول پیدا کرنا چاہتا ہے ـــ غلط ثابت ہو جاتا ہے۔

آیت لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّین کو صاحب موصوف نے خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے اور بڑے زوردار انداز میں اس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دین میں کسی طرح کے جبر و اکراہ کی کوئی گنجائش نہیں نہ دینِ اسلام قبول کرنے پر کسی کو مجبور کیا جا سکتا ہے اور نہ دین سے انحراف و ارتداد کے راستے میں کوئی رکاوٹ ڈالی جا سکتی ہے۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے اُس سے تو کسی کو اختلاف نہیں۔ لیکن دوسری بات یعنی ارتداد کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے سے یکسر اجتناب البتہ محلِ نظر ہے۔ سوال یہ ہے کہ دینِ اسلام کو قبول کرنے والا اگر اپنی آزاد مرضی سے چوری کرے تو ہاتھ کاٹنے کا جبر جائز، آزادئ ضمیر کے تحت زنا کر بیٹھے تو سو کوڑے کھانے پر مجبور کرنا بھی جائز تاہم اگر خدا و رسول کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کرنے والا اس عہد سے منحرف ہونا چاہیے اور اسلامی نظامِ حکومت اس سب سے بڑے عہد کو زندہ رہنے کا حق نہ دے تو یہ جبر آخر ناجائز کیوں؟ اسلام جب نام ہی خدا اور رسول کی طرف سے عائد کردہ پابندیاں قبول کرنے کا ہے تو یہ پابندی کہ قبولِ اسلام کے بعد ارتداد کی اجازت نہیں ـــ نامنظور کیوں؟ کون سی عقلی، اخلاقی اور شرعی بنیاد کی رو سے یہ غلط ہے۔ اور اگر کسی کو یہ پابندی قبول نہیں تو وہ اسلام کو اختیار ہی کیوں کرتا ہے؟ ہمارے سابق چیف جسٹس کے ساتھ اگر کوئی شخص بار بار عہد و پیمان کر کے انحراف کرتا چلا جائے اور انہیں کئی طرح کے نقصانات پہنچاتا رہے تو اُس کے خلاف تو موصوف کو قانونی کارروائی کا حق حاصل ہو اور وہ انسانی آزادی کو کچلنے کے درپے ہو جائیں لیکن انحراف و ارتداد کا یہ سنگین مذاق اگر کوئی بدطینت خالقِ کائنات کے ساتھ روا رکھے تو اس کی کھلی اجازت ہو اور کم از کم دنیا میں اس کا کوئی نوٹس نہ لیا جائے ـــ یہ منطق ہماری سمجھ سے تو بالاتر ہے۔

مذکورہ بالا گزارشات تو اُس نام نہاد آزادی سے متعلق تھیں جو ہمارے بعض کرم فرما پاکستان میں دین و ایمان کے دائرہ کے اندر جاری و ساری دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور جس کا آئے دن ان کے مغربی آقاد

امام پر چار کرتے رہتے ہیں۔

اب ہم اُن آیات کا جائزہ لیتے ہیں جن سے کتاب میں اس امر کے لیے استدلال کیا گیا ہے کہ قرآن میں ارتداد کی سزا قتل نہیں

(۱) وَمَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَیَمُتْ وَھُوَ کَافِرٌ فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ۔ (البقرہ: ۲۱۷)

اور تم میں سے جو کوئی اس دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں جان دے گا اس کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو جائیں گے۔

(۲) اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِھِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُھُمْ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الضَّآلُّوْنَ۔ (آل عمران: ۹۰)

جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے ان کی توبہ بھی قبول نہ ہو گی ایسے لوگ تو پکے گمراہ ہیں۔

(۳) اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ سَبِیْلًا۔ (النساء: ۱۳۷)

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے پھر کفر کیا پھر ایمان لائے پھر کفر کیا پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے تو اللہ ہرگز ان کو معاف نہ کرے گا اور نہ کبھی ان کو راہِ راست دکھائے گا۔

(۴) یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ۔ (المائدہ: ۵۴)

اے ایمان لانے والو اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دیگا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ اُن کو محبوب ہو گا۔

جناب ایس اے رحمان صاحب نے مندرجہ بالا آیات اور اسی مضمون کی چند اور آیات نقل کرنے کے بعد اس نکتہ کو زوردار طریقے سے بتکرار بیان کیا ہے کہ دیکھ لیجئے ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے

کے بعد کفر کی طرف پلٹ جانے کا ذکر کیا ہے مگر اس ارتداد کی سزا کہیں قتل بیان نہیں کی البتہ آخرت میں سزا دینے کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں ہماری معروضات حسبِ ذیل ہیں:

(۱) یہ امر معلوم و مسلّم ہے کہ قرآن پاک کا نزول حالات و مواقع کی مناسبت سے ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بالعموم آیاتِ تربیت و اصلاح اور تزکیۂ نفس مکی زندگی میں نازل ہوئیں اور آیاتِ احکام کا نزول جیسے جیسے حالات و ضروریات داعی ہوئیں مدینہ منورہ میں جا کر ہوا۔

(۲) ارتداد کی سزا قتل ہر شخص دینے کا مجاز نہیں نہ انسانوں کا کوئی گروہ اور جماعت جو اختیاراتِ حکومت سے محروم ہو بلکہ یہ کام اسلامی حکومت کے کرنے کا ہے۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں مکمل اقتدارِ حکومت فتح مکہ کے بعد آیا۔

(۳) کتاب میں ایک ترتیب سے جو آیات نقل کی گئی ہیں اور جن میں مذکورہ بالا مضمون بیان ہوا ہے وہ سورۃ بقرہ، سورۃ آلِ عمران، سورۃ النساء، سورۃ المائدہ، سورۃ النحل اور سورۃ الحج کی آیات ہیں۔ اب ایک نظر ان سُور کے زمانۂ نزول پر ڈال لی جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کن حالات میں مذکورہ آیات نازل ہوئی ہیں نیز یہ کہ آیا وہ حالات ایسے تھے کہ ان میں ارتداد کی سزا کا حکم بیان کیا جاتا یا اُس کا نفاذ عمل میں لایا جا سکتا۔

سورۃ بقرہ کا بیشتر حصہ ہجرتِ مدینہ کے بعد مدنی زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوا ہے سود کی ممانعت والی آیات البتہ بہت بعد نازل ہوئیں۔ اور سورۃ کا خاتمہ جن آیات پر ہوا ہے وہ ہجرت سے قبل مکہ میں نازل ہو چکی تھیں۔ سورۃ النساء کی مندرجہ بالا آیت جس سلسلۂ کا حصہ ہیں وہ جنگِ بدر کے بعد قریب کے زمانے میں نازل ہوا۔ سورۃ النساء متعدد خطبوں پر مشتمل ہے جو غالباً ۳ھ کے اواخر سے لے کر ۴ھ کے اواخر یا ۵ھ کے اوائل تک مختلف اوقات میں نازل ہوئے۔ سورۃ المائدہ کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے اور روایات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ صلح حدیبیہ کے بعد ۶ھ کے اواخر یا ۷ھ کے اوائل میں نازل ہوئی۔ سورۃ النحل کا زمانۂ نزول مکہ کا آخری دور ہے۔ سورۃ الحج کا ایک حصہ مکی دور کے آخر میں اور دوسرا حصہ مدنی دور کے آغاز میں نازل ہوا ہے۔ (ماخوذ از تفہیم القرآن)

مندرجہ بالا سُور کے زمانہ ہائے نزول کے تعین سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ وہ حالات

ایسے بہرحال نہیں تھے کہ ان میں ارتداد کی سزا دی جاسکتی۔ اور قرآن کا معمول یہ اصول بھی یہ نہیں کہ وہ بہت پہلے ایک ایسا حکم صادر کردے جس پر عمل درآمد دسالوں بعد جاکر ہونا ہو۔

(۴) جن حالات میں یہ آیات نازل ہوئیں ان میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا تھا کہ دین کے ساتھ اس نوعیت کا مذاق کرنے والوں کو تنبیہ کی جاتی انہیں آخرت کے عذاب النار سے ڈرایا جاتا۔ دنیا میں قبولِ اسلام کے نتیجے میں جو حقوق و مراعات انہیں حاصل تھیں وہ سلب کرلی جاتیں۔ ان کی مغفرت کا دروازہ بند کردیا جاتا اور ان کی توبہ تک بھی قبول نہ کی جاتی۔

(۵) یہ تو وہ آیات تھیں جو سزائے ارتداد کے باب میں خاموش ہیں۔ اب سورۃ التوبہ کی ایک آیت ملاحظہ کیجیے جس میں واضح طور پر ارتداد کی سزا (قتل) کا ذکر کیا گیا ہے۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ۭ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ۝ (التوبۃ: ۱۲)	پھر اگر وہ (کفر سے) توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔ ہم اپنے احکام ان لوگوں کے لیے واضح طور پر بیان کر رہے ہیں جو جانتے ہیں۔ لیکن اگر وہ عہد (قبولِ اسلام کا عہد) کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں اور تمہارے دین پر زبانِ طعن دراز کریں تو پھر کفر کے لیڈروں سے جنگ کرو۔ کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں۔ شاید کہ وہ اس طرح باز آجائیں۔

یہ آیت سورۃ توبہ میں جس سلسلے میں نازل ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ۹ھ میں حج کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے اعلانِ براءت کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس اعلان کا مفاد یہ تھا کہ جو لوگ اب تک خدا اور اس کے رسول کے ساتھ لڑتے رہے ہیں اور ہر طرح کی زیادتیوں اور بدعہدیوں سے خدا کے دین کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے رہے ہیں اُن کو اب زیادہ سے زیادہ چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے۔ اس مدت میں وہ اپنے معاملے پر غور کرلیں۔ اسلام قبول کرنا ہو تو قبول کرلیں معاف

کر دیے جائیں گے۔ ملک چھوڑ کر نکلنا چاہیں تو نکل جائیں مدتِ مقررہ کے اندر اُن سے تعرض نہ کیا جائے گا اِس کے بعد جو لوگ ایسے رہ جائیں جنہوں نے نہ اسلام قبول کیا ہو اور نہ ملک چھوڑا ہو اُن کی خبر تلوار سے لی جائے گی۔ اِس سلسلہ میں فرمایا گیا کہ "اگر وہ توبہ کر کے ادائے نماز و زکوٰۃ کے پابند ہو جائیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ لیکن اگر اس کے بعد وہ پھر اپنا عہد توڑ دیں تو کفر کے لیڈروں سے جنگ کی جائے" یہاں عہد شکنی سے مراد کسی طرح بھی سیاسی معاہدات کی خلاف ورزی نہیں لی جا سکتی بلکہ سیاقِ عبارت صریح طور پر اِس کے معنی "اقرارِ اسلام سے پھر جانا" متعین کر دیتا ہے اور اِس کے بعد فَقَاتِلُوٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتے کہ مرتدین یا کفر کی تحریک کو تقویت پہنچانے والوں سے جنگ کی جائے۔

یہاں یہ امر واضح رہے کہ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ میں ایک قراءت اِنَّهُمْ لَآ اِيْمَانَ لَهُمْ بھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قبولِ اسلام کا عہد توڑنے اور دین میں طعن کرنے والوں کا کوئی ایمان نہیں لہٰذا ان کے خون اور اموال کی حفاظت کا کوئی جواز نہیں۔ (فتح القدیر للعلامہ الشوکانی) اس دوسری قراءت کی رو سے مذکورہ آیت، زیرِ بحث مسئلہ میں اور بھی صریح اور واضح ہو جاتی ہے۔

(۶) یہ حکم اُس وقت نازل ہوا جب عرب میں اسلامی حکومت کی بنیاد پڑ چکی تھی اور مکمل اقتدار آپؐ کے ہاتھ میں تھا چنانچہ اس پر بلا تاخیر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ اور خود حضورؐ سرورِ کائنات کے عہدِ مبارک میں قتلِ مرتد کا ایک واقعہ یمن میں پیش آیا۔ اگر یمن کے گورنر کا یہ قتل واقعی اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ پر مبنی نہ ہوتا تو یقیناً نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس پر یمن کے گورنر سے باز پرس فرماتے۔

(۷) عجیب بات ہے کہ فاضل مصنف نے یہ ثابت کرتے وقت کہ قرآن میں ارتداد کی سزا قتل کہیں مذکور نہیں جن مفسرین کے تفسیری اقوال نقل کیے ہیں اور جن شخصیات کی کتب کے حوالے دیے ہیں وہ خود ارتداد کی سزائے قتل کے قائل ہیں اب اسے ذہن کی فنکاری ہی کہا جا سکتا ہے کہ قائلینِ سزائے ارتداد کے حوالہ جات دے کر انکارِ سزائے ارتداد کیا جا رہا ہے۔

سزائے ارتداد سنت میں اپنی کتاب کے دوسرے باب میں فاضل مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سنتِ رسول میں بھی ارتداد کی سزا قتل نہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے انہوں نے خود سنت کی حقیقت بیان کی ہے۔

امام شاطبی کی موافقات، امام شافعی کے الرسالہ اور شاہ ولی اللہ کے حجۃ اللہ البالغہ کے اردو تراجم وغیرہ کے حوالے سے آپ لکھتے ہیں کہ حدیث قرآن کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ سنت ایک ثانوی درجہ کی چیز ہے۔ خبرِ واحد جو قرآن کے خلاف ہوگی اسے رد کر دیا جائے گا۔ صحیحین اور الموطا پہلے درجہ کی قابلِ اعتماد کتبِ حدیث ہیں۔ ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور نسائی کی سنن اور مسند احمد دوسرے درجہ کی اور باقی تمام کتبِ حدیث ناقابلِ اعتماد ہیں۔ خبرِ واحد کے ضمن میں ایک اور بات جس کی خاص طور پر نشاندہی کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ راویانِ حدیث کا سہو و نسیان اور کسی حدیث سے متعلقہ صورتِ حال کو سمجھے بغیر روایت کرنا۔

احادیث و سنت میں ارتداد کی سزا کے بیان سے پہلے اس نوعیت کی تمہید ناقابلِ فہم نہیں۔ احادیث کے معاملہ میں مصنف جو مخصوص ذہن رکھتے ہیں اہلِ علم اس سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اس تمہید میں بیان کردہ امور کے بارے میں ہماری دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ انھوں نے اسے لکھ کر عام مسلمانوں کی نظر میں حدیث و سنت کے مقام کو گرانے کی کوشش کی ہے۔

یہ کسی کا بھی مسلک نہیں کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ حدیث قرآن پاک کی تبیین و تشریح کرتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ حدیث و سنت کی تبیین و تشریح کے بغیر قرآن کو سمجھنا ناممکن ہے۔[۵۱] رہا سنت کا ثانوی درجہ کی ایک چیز ہونا تو اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ سنت کتاب اللہ کے بعد دوسرا شرعی ماخذ ہے تو ٹھیک ہے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ جس تناظر میں یہ بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اصل مآخذ شرعی تو قرآن ہے سنت البتہ ایک ثانوی درجہ کی چیز ہے جسے ہر حال میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مغالطہ انگیز طرزِ کلام اختیار کر کے صاحبِ تصنیف کوئی کارِ خیر انجام نہیں دے رہے ہیں۔ جمہور اہلِ سنت قرآن ہی کی طرح سنت کو بھی ماخذِ شرعی مانتے ہیں شریعتِ اسلامیہ جس طرح قرآن سے ثابت ہوتی ہے اسی طرح احادیث و سنت سے ثابت ہے۔[۵۲] پس احادیث کی اہمیت

---

۵۱ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل: ۴۴)

۵۲ امام ابن قیم، اعلام الموقعین میں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فامر تعالیٰ بطاعته وطاعة رسوله واعاد الفعل اعلاما بان طاعة الرسول

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور الرسول

بقیہ حاشیہ

گھٹانے کی نہیں بلکہ بتانے کی ضرورت ہے اس سلسلہ میں امام اوزاعیؒ کا یہ قول یاد رکھنے کی چیز ہے۔ الکتٰب احوج الی السنۃ من السنۃ الی الکتاب ۔ (قرآن پاک اس سے زیادہ سنت کا محتاج ہے جتنا کہ سنت قرآن کی محتاج ہے)۔ صحابہ کرام کی نظر میں سنت کی کیا اہمیت تھی اس کا اندازہ مندرجہ ذیل حدیث سے لگایا جا سکتا ہے:

عن عبد الله بن مسعود قال لعن الله الواشمات والمستوشمات والمتنمصات والمتفلجات للحسن المغيرات خلق الله	حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ اللہ نے لعنت بھیجی ہے سوئی چبھو کر حسین بننے والی عورتوں پر اور سوئی چبھونے کا مطالبہ کرنے والیوں پر اور

بقیہ حاشیہ صفحہ

تجب استقلالا من غير عرض ما امر به على الكتاب بل اذا امر وجبت طاعته مطلقا سواء كان ما امر به في الكتاب او لم يكن فيه ۔ فانه اوتي الكتاب و مثله معه و لم يامر بطاعة اولي الامر استقلالا بل حذف الفعل و جعل طاعتهم في ضمن طاعة الرسول ۔	کے لیے اطیعوا کے فعل کا اعادہ اس لیے کیا ہے تاکہ رسول کی اطاعت مطلق طور پر واجب ہو جائے بغیر اس کے کہ رسول کے حکم کو کتاب اللہ کے آگے پیش کیا جائے ۔ لہٰذا رسول جب حکم دے تو اس کی اطاعت مطلقاً واجب ہو جاتی ہے چاہے وہ حکم کتاب اللہ میں موجود ہو یا نہ ۔ اس لیے کہ اسے کتاب بھی دی گئی ہے اور اس کا مثل (سنت) بھی ۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اولی الامر کی اطاعت کا حکم مطلق طور پر نہیں دیا بلکہ ان کے لیے اطیعوا کے فعل کو حذف کر دیا اور ان کی اطاعت کو طاعتِ رسول کے ضمن میں رکھ دیا ۔ (اعلام الموقعین جلد اول صـ ۴۸)

فجاءته امرأة فقالت انه بلغني انك لعنت كيت وكيت فقال ما لي لا العن من لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم ومن هو في كتاب الله فقالت لقد قرأتُ مابين اللوحين فما وجدت فيه ما تقول. قال لئن كنتِ قرأتيه لقد وجدتيه اما قرأتِ مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا. قالت بلى. قال فانه قد نهى عنه

(متفق علیہ)

چہرے سے بال نوچنے والی عورتوں پر اور دانتوں کو باریک کرکے ان کے مابین شگاف پیدا کرنے والی عورتوں پر اللہ نے لعنت بھیجی ہے اس لیے کہ وہ اللہ کی بناوٹ کو بدل دیتی ہیں ۔ اس حدیث کے روایت کرنے پر ایک عورت حضرت عبداللہ کے پاس آئی اور کہنے لگی مجھے خبر پہنچی ہے کہ آپ فلاں فلاں قسم کی عورتوں پر لعنت بھیجتے ہیں ۔ انہوں نے فرمایا میں کیوں لعنت نہ بھیجوں ان پر جنہیں خود رسولؐ اللہ نے ملعون قرار دیا ہے ۔ اور جن پر کتاب اللہ میں لعنت بھیجی گئی ہے ۔ وہ عورت کہنے لگی میں نے پورے قرآن کو پڑھا ہے مجھے تو کہیں وہ بات نظر نہیں آئی جو آپ کہہ رہے ہیں ۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا اگر تو نے اسے پڑھا ہوتا تو تجھے ضرور وہ بات مل جاتی کیا تو نے یہ آیۃ نہیں پڑھی ما اٰتکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا ۔ جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے منع کرے اس سے رک جاؤ ۔ وہ عورت بولی ہاں یہ آیت تو پڑھی ہے ۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا تو تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ رسول پاک نے ان کاموں سے منع فرمایا ہے ۔ لہٰذا یہ ممانعت ایسی ہی ہے جیسے کہ اللہ نے کتاب اللہ میں بیان فرمائی ہو)۔

صحابہ کے دل و دماغ میں سنت کا یہ مقام بلند خود رسولِ پاک نے جاگزیں کیا تھا ۔ حضرت مقداد بن

معدیکرب راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آگاہ رہو مجھے قرآن عطا کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اتنا علم اور بھی بخشا گیا ہے۔ خبردار قریب ہے کہ کوئی شکم سیر آدمی اپنے پلنگ پر بیٹھ کر کہنے لگے لوگو اس قرآن کو لازم پکڑ لو پھر جو کچھ تم اس میں حلال پاؤ اسے حلال سمجھو اور جو کچھ اس میں حرام پاؤ اسے حرام قرار دو حالانکہ اللہ کے رسول نے جس چیز کو حرام کر دیا اس کی حرمت بھی ایسے ہی ہے جیسے اللہ کی حرام کردہ چیز کی حرمت (مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ) اسی طرح ایک اور مقام پر بھی آپ نے مقام سنت کی وضاحت فرمائی صحیح مسلم کی حدیث ہے۔ ایک بدو نے رسول پاک کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر کہتا ہوں آپ میرے معاملہ کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کریں۔ دوسرے فریق نے بھی کہا فاقض بیننا بکتاب اللہ۔ آپ نے دونوں کی بات سنی۔ صورت یہ تھی کہ ایک آدمی کے غیر شادی شدہ بیٹے نے دوسرے آدمی کی بیوی سے زنا کیا تھا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لاقضین بینکما بکتاب اللہ الولیدۃ والغنم رد وعلی ابنك جلد مائۃ وتغریب عام اغد یا انیس الی امراۃ ھذا فان اعترفت فارجمھا۔	اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ لونڈی اور بکریاں تجھے واپس کی جاتی ہیں اور تیرے بیٹے کو سو کوڑے لگیں گے اور ایک سال کے لیے جلا وطن کیا جائیگا اور اے انس تم اس آدمی کی عورت کے پاس جاؤ اگر وہ اعترافِ زنا کرے تو اسے رجم کر دینا۔

اس حدیث میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ کتاب اللہ میں کہیں تغریب عام کا ذکر نہیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ یہ فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق ہے۔ اس سے جو کچھ بدا ہتًا مستفاد ہے وہ یہ ہے کہ سنتِ ثابتہ کا مقام بھی تشریعِ اسلامی میں کتاب اللہ جتنا ہی ہے۔

خبرِ واحد کے بارے میں یہ خیال کہ وہ قرآن کے خلاف ہو سکتی ہے غلط خیال ہے۔ کوئی صحیح حدیث قرآن کے خلاف نہیں ہوتی یہ ہمارا قصورِ فہم ہے اگر وہ قرآن کے خلاف نظر آتی ہو۔ محققین نے ایسی احادیث میں تطبیق و موافقت دے کر ثابت کیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ کوئی خبر واحد جسے عادل و تام الضبط رواۃ نے بسندِ متصل روایت کیا ہو وہ قرآن کے خلاف نہیں بلکہ جمہور علماء نے ایسی احادیث کو قبول کیا ہے اور اُن سے حجت

پکڑی ہے۔ صحیحین اور موطا کی اخبارِ آحاد کے متعلق شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں فرمایا ہے:

اما الصحیحان فقد اتفق المحدثون علیٰ ان جمیع ما فیهما من المتصل المرفوع صحیح بالقطع وانهما متواتران الیٰ مصنفیهما وانه کل من یهون امرهما فهو مبتدع متبع غیر سبیل المؤمنین۔ (جلد ا۔ ص۱۳۴)

جہاں تک صحیحین کی احادیث کا تعلق ہے تو محدثین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ان میں درج شدہ تمام متصل اور مرفوع روایات قطعی الصحت ہیں نیز یہ کہ وہ ان کے مصنفین تک متواتر ہیں۔ اور ہر وہ شخص جو صحیحین کا مرتبہ و مقام گرانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ مبتدع ہے اور اہلِ ایمان کے راستہ سے ہٹ کر چلنے والا۔

اور موطا امام مالک کے بارے میں شاہ صاحب کا ارشاد ہے:

واتفق اهل الحدیث علیٰ ان جمیع ما فیه صحیح علیٰ رای مالك ومن وافقه واما علیٰ رائ غیره فلیس فیه مرسل ولا منقطع الا قد اتصل السند به من طرق اخری فلا جرم انها صحیحة من هذا الوجه۔

محدثین نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ موطا میں درج شدہ تمام روایات و آثار امام مالکؒ اور ان کے موافقین کے نزدیک صحیح ہیں۔ اور جو ان کے ہم مسلک نہیں ان کے نزدیک بھی اس میں اگر کوئی مرسل یا منقطع روایت آئی ہے تو وہ دوسرے طرق سے متصل السند ثابت ہو چکی ہے۔ پس اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اس لحاظ سے موطا امام مالک کی روایات صحیح ہیں۔

اور یہ جو فاضل مصنف نے شاہ ولی اللہ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ کتبِ حدیث جو تیسرے اور چوتھے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں وہ قابلِ اعتماد نہیں غلط ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ تیسرے طبقے کی مسانید و جوامع میں صحیح و حسن، ضعیف و غریب اور شاذ و منکر روایات ملی جلی ہیں۔ ان کتبِ حدیث سے اہلِ علم ہی استفادہ کر سکتے ہیں اور انہی کے لیے صحیح و حسن روایات کو شاذ و منکر روایات سے الگ چھانٹ لینا ممکن ہے۔ شاہ صاحب کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

واما الثالثة فلا يباشر ها	تیسرے درجہ کی کتبِ احادیث کے مندرجات
للعمل عليها والقول بها الا	کو عمل کے لیے پیش کرنا یا ان کے بارے میں کچھ
النحارير الجهابذة الذين يحفظون	کہنا اُن بڑے بڑے اہلِ علم کا کام ہے جو
اسماء الرجال وعلل الاحاديث	اسماء الرجال اور علل الاحادیث کا علم رکھتے
نعم ربما يوخذ منها المتابعات	ہیں۔ اس طبقہ کی کتب میں سے اکثر متابعات
والشواهد	وشواہد حاصل کیے جاتے ہیں۔

گذارش کرنے کا منشا یہ ہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک تیسرے درجہ کی کتبِ احادیث میں مندرج تمام روایات ناقابلِ اعتماد نہیں بلکہ اہلِ علم جن روایات کو صحیح پائیں وہ قابلِ قبول ہیں اور لائقِ اعتماد۔ چوتھے درجے کی کتبِ احادیث مثلاً کتاب الضعفاء لابن حبان و کامل ابنِ عدی اور الخطیب، ابی نعیم، الجوزقانی، ابن عساکر، ابن نجار اور الدیلمی کی کتب اور الخوارزمی کی مسند پر انحصار و انتصار کو البتہ شاہ صاحب درست نہیں سمجھتے۔

آخری بات جو اس تمہید میں فاضل مصنف اپنے قاری کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ رواۃِ حدیث بہرحال انسان تھے ان سے بھول چوک ممکن ہے اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ وہ رسولِ پاک کے کسی ارشاد کو اس کے صحیح پس منظر میں سمجھ ہی نہ سکے ہوں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے حضرت عمرؓ یا حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک روایت در بابِ عذابِ میت بھی نقل کی ہے جس کی توضیح و تصحیح حضرت عائشہؓ نے کی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں کہ ہر وہ روایت جو اس کتاب کے مصنف یا منکرینِ حدیث کو ناقابلِ قبول ہو — کی روایت میں راوی سے لازمی طور پر سہو ہو گیا ہے۔ سہو اگر کہیں ہوا ہے تو اس کی نشاندہی اُسی زمانے میں کر دی گئی نہ کہ اس کام کو بیسویں صدی کے دانشوروں پر چھوڑ دیا گیا۔ (باقی آئندہ)

مطبوعات

رہنمائے حجاج مؤلف مولانا خلیل الرحمٰن نعمانی - ناشر: اقبال بک ہاؤس صدر کراچی ۳ - کتابت طباعت دیدہ زیب - کاغذ سفید - کتابی سائز - ۳۳۶ صفحات - قیمت چھ روپے -

زیرِ نظر کتاب عام حجاج کرام جو مسائل و مناسکِ حج کی پوری واقفیت نہیں رکھتے - کے استفادہ کے لیے سپردِ قلم کی گئی ہے - فاضل مولف نے فقہ حنفی کے مطابق تمام مسائل بیان کیے ہیں اور اندازِ بیان نہایت سلیس اور عام فہم اختیار کیا ہے -

کتاب ایک سو بیالیس چھوٹے چھوٹے موضوعات پر مشتمل ہے - جن میں تاریخ کعبہ و حج، فرضیت و فضائلِ حج، خاص مقامات اور اصطلاحی الفاظ کی تشریح، حج کے ارکان و فرائض، مسائلِ احرام، مسائلِ عمرہ و طواف و سعی، شرائط و سننِ وقوف، مسائل درباب رمیِ جمار و قربانی و حلق، ادعیۂ مسنونہ، طوافِ زیارت، مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کے مقدس مشاہد و مقابر اور دیگر زیارات کا مفصل بیان موجود ہے - حسنِ ترتیب کا یہ عالم ہے کہ معمولی پڑھا لکھا حاجی بھی، حج سے متعلق کوئی سا ضروری مسئلہ بآسانی تلاش کر سکتا ہے -

رہنمائے حجاج حقیقتاً حجاج کرام کے لیے رہنما کتاب ہے اور ہم اس سعادت سے بہرہ ور ہونے والے تمام حنفی المسلک حضرات سے اس کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں - نیز فاضل مولف کی توجہ کے لیے یہ بھی اتنا عرض ہے کہ کتاب میں مختلف مقامات پر مانگی جانے والی دعائیں تمام تر بلا حوالہ درج ہیں - جو مناسب نہیں - حج مسنون طریقہ پر ادا کیا جانا چاہیئے اور دورانِ حج مانگی جانے والی تمام دعائیں بھی مسنون ہونی چاہئیں - تبصرہ نگار کی نظر میں مؤلف کا یہ اسلوبِ تحقیق درست نہیں کہ "بعض علماء نے طواف کے ہر چکر کے لیے دعائیں بیان کی ہیں - جو درج ذیل ہیں" صـ ۱۲۱ - نیز یہ کہ "بعض حضرات نے لکھا ہے کہ منیٰ میں ۹ ذی الحج کی شب کو اگر کوئی ایک ہزار مرتبہ یہ تسبیح پڑھ کر دعا کرے تو جو مراد مانگے پوری ہو (صـ ۱۶۱) مسائلِ حج و عمرہ کے مستند اور معتبر مجموعہ میں ایسی باتوں کا اندراج کسی طرح بھی صحیح نہیں - کیونکہ یہی چیزیں آگے چل کر پختہ مسائل کا روپ دھار کر لیتی ہیں اور یوں شریعت کے اندر "ایک شریعت" وجود میں آ جاتی ہے -

---

واردات زنداں مصنف و ناشر ابو کامران احمد ایم اے بھوپال والا۔ تحصیل ڈسکہ ضلع سیالکوٹ۔
کتابت طباعت گوارا۔ سفید کاغذ۔ صفحات ۱۰۸۔ قیمت ۲/۵۰ روپے۔

یہ کتابچہ دراصل ایک " روداد اسیری" پر مشتمل ہے جس میں ہمارے دوست چودھری نذیر احمد صاحب نے جیل کی زندگی کے بعض پوشیدہ مگر دلچسپ گوشے بے نقاب کیے ہیں۔ موصوف کو جماعت اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلس شوریٰ کے ایک رکن کی حیثیت سے ۶ جنوری ۱۹۶۴ء کو قانون تحفظ امن عامہ کے تحت دو ماہ کے لیے گرفتار کیا گیا تھا مگر بعد ازاں نظر بندی کی میعاد میں بار بار اضافہ کیا جاتا رہا۔ زیر نظر کتابچہ اسی عہد اسیری کے تاثرات کا عکاس ہے شستہ و شگفتہ اردو میں چودھری صاحب کے قلم نے بعض معمولی واقعات سے اچھوتے نتائج اخذ کیے ہیں۔ ہم تحریک اسلامی کے سرگرم کارکنوں سے واردات زنداں کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں

توشۂ آخرت حصہ دوم مؤلف و ناشر محمد عبدالحمید صدیقی ایڈووکیٹ۔ خالد بن ولید روڈ کراچی ۲۹۔
کتابت طباعت گوارا۔ سفید کاغذ۔ بڑے سائز کے ۴۳۱ صفحات۔ قیمت ۱۰/- روپے

زیر تبصرہ کتاب بنیادی طور پر قرآن حکیم کا اشاریہ ہے جس میں دنیوی معاملات سے متعلق احکام قرآنی کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ تمام آیات کا استحصار نہیں کیا گیا۔ مرتب کا عزم یہ ہے کہ قرآن پاک کے جملہ مضامین کی تدوین اسی طرح کی جائے گی۔ پہلا حصہ جو احکام عبادات پر مشتمل ہے ۔ اس کی طباعت کی نوبت ابھی نہیں آئی۔

اردو دان طبقہ تک قرآن پاک کی تعلیمات پہنچانے کے لیے محترم مولف نے ہر موضوع کے تحت درج کردہ آیات کا ترجمہ و تفسیر بھی دے دیا ہے۔ ترجمہ و تفسیر کے لیے عموماً تفسیر ماجدی پر انحصار کیا گیا ہے۔

مؤلف نے خدمت دین و ملت کے جس جذبہ سے یہ کتاب تالیف کی ہے وہ بہت کچھ قابل قدر ہے۔ جدید علوم سے بہرہ ور مگر قرآن حکیم کی تعلیمات سے نابلد لوگوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ مفید رہے گا۔

عشرہ مبشرہ تالیف۔ قاضی حبیب الرحمٰن صاحب۔ شائع کردہ مکتبہ نذیریہ الپسنگین سٹریٹ، اچھرہ، لاہور
زیر تبصرہ کتاب اُن مقدس ہستیوں کے حالات زندگی پر مشتمل ہے جنہیں حضورؐ سرور کائنات کی بارگاہ اقدس میں رہنے کا موقع ملا اور جنہیں حضورؐ نے اُن کی زندگیوں میں جنت کی بشارت دی۔ اس

کتاب کے مطالعہ سے ایمان میں تازگی پیدا ہوتی ہے۔ کتاب کے مصنف مشہور عالم دین قاضی محمد سلیمان منصور پوری کے برادر زادہ ہیں۔ مولانا محمد حنیف یزدانی نے اس کتاب کی بڑی محنت سے تصحیح اور تخریج کی ہے۔ مادہ پرستی کے اس دور میں پاکیزہ زندگیوں کے مطالعہ کی اشد ضرورت ہے اور اس میدان میں جتنا بھی کام کیا جائے کم ہے۔

کتاب کی قیمت ساڑھے سات روپے کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

(بقیہ اشارات)

بات کا بھی کوئی علم نہیں کہ جب کوئی جماعت یا قوم کوئی ایسا انقلابی پروگرام لے کر اٹھے جس کا مقصد پوری زندگی کے نقشے کو بدلنا ہو تو مخالف قوتیں لازمی طور پر اس کی راہ میں مزاحم ہوتی ہیں۔ جس طرح طلوع آفتاب کے بعد غروب آفتاب ایک حتمی حقیقت ہے بالکل اسی طرح انقلاب کا راستہ پھولوں کی سیج نہیں بلکہ مزاحمتوں، مخالفتوں اور مخاصمتوں سے پر ایک نہایت ہی دشوار گزار گھاٹی ہے جسے طے کرنے کے بعد ہی کوئی قافلہ کامیابی کی منزل تک پہنچتا ہے۔ مزاحمت کے انداز اور دوائر تو مختلف ہو سکتے ہیں مگر جہاں تک اس انقلابی پروگرام کی راہ میں حائل ہونے کا تعلق ہے اس میں ساری قوتیں ایک دوسرے سے متفق اور متحد ہوتی ہیں اور عملی اشتراک کے بھی کئی ایک راستے نکال لیتی ہیں۔

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن

ہمارے درج ذیل ایجنٹ حضرات سے دستیاب ہو سکتی ہے

۱۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، شاہ عالم مارکیٹ لاہور

۲۔ فیروز سنز لمیٹڈ، دی مال، لاہور

۳۔ مکتبہ تنویر القرآن اردو بازار لاہور

۴۔ نورسی پبلیکیشنز، لیاقت آباد کراچی۔

۵۔ مکتبہ تعمیر افکار اسلامی بالائی منزل حسین ڈیکوریشن ناظم آباد کراچی

۶۔ شیخ سنز، اُردو منزل، اُردو بازار کراچی

۷۔ طاہر بک ایجنسی اُردو بازار کراچی

۸۔ مسعود علی رضوی رضوان آباد فیڈرل بی ایریا منصورہ کراچی ۳۸

۹۔ اتحاد بک ڈپو، گاڑی کھاتا حیدر آباد

۱۰۔ مکتبہ اسلامی، کورٹ روڈ حیدر آباد

۱۱۔ رحمان نیوز ایجنسی، شارع فاطمہ جناح کوئٹہ

۱۲۔ مکتبہ اسلامی معرفت دفتر جماعت اسلامی جیکب آباد

۱۳۔ مصاحب علی صاحب امیر جماعت اسلامی نواب شاہ

۱۴۔ عجائب سٹور (رجسٹرڈ) فریئر روڈ سکھر

۱۵۔ حافظ غلام علی صاحب امیر جماعت اسلامی سرگودھا ڈویژن

۱۶۔ ملت بک ڈپو ریلوے روڈ رحیم یار خاں

۱۷۔ عزیز اینڈ سنز شاہی بازار لاڑکانہ

۱۸۔ امداد علی قادری مکتبہ اسلامی فقیر علی خاں

۱۹۔ مکتبہ احیائے ملت کپ بازار ملتان

۲۰۔ میاں محمد شفیع صاحب آٹرن مرچنٹ جناح چوک میاں چنوں

۲۱۔ ضیا بک ڈپو، چمن بازار ہارون آباد

۲۲۔ قاری محمد عبداللہ صاحب مسجد گول چوک اوکاڑہ

۲۳۔ حاجی دین محمد صاحب ماموں کانجن

۲۴۔ مکتبہ اسلامیہ کھیوڑہ ضلع جہلم

۲۵۔ چوہدری راجہ علی صاحب مشین محلہ جہلم

۲۶۔ مولوی غلام رسول صاحب منڈی بہاؤ الدین

۲۷۔ مکتبہ اسلامیہ منڈی بازار لالہ موسیٰ

۲۸۔ مکتبہ افکار اسلامی ۴۴۷ بازار تلواڑاں راولپنڈی

۲۹۔ تجدد صاحب بزاز حضرو ضلع کیمبل پور

۳۰۔ عبدالعزیز دکان نمبر ۲۱ ایریا مارکیٹ واہ کینٹ

۳۱۔ فیئر جنرل سٹور آب پارہ اسلام آباد

۳۲۔ شیخ سعید احمد خاں سارہ مارکیٹ فاروق جنرل سٹور ڈیرہ غازی خان

۳۳۔ خواجہ محمد یونس کندھکوٹ

۳۴۔ حکیم محمد اسحاق حویلیاں (۳۵) فیض محمد ہری پور ہزارہ

۳۶۔ شوکت کریانہ سٹور، مانسہرہ

۳۷۔ مکتبہ اسلامی، بنک روڈ، مردان

۳۸۔ عزیزیہ کتب خانہ چوک صرافہ بازار ڈیرہ اسماعیل خان

۳۹۔ بک سنٹر کچہری روڈ کیمبل پور

۴۰۔ ظفر برادرز نیوز ایجنسی بک سیلرز چوک بازار حسن ابدال

۴۱۔ عبدالقدوس صاحب دفتر جماعت اسلامی تہاد دروازہ پشاور

۴۲۔ عبدالرحمٰن شاہ خطیب جامع مسجد غزنی خیلاں بنوں شہر

۴۳۔ ضیاء بک ڈپو نیو روڈ منگورہ

۴۴۔ حاجی محمد اسمٰعیل مکتبہ اسلامی برتن منڈی میرپور خاص

۴۵۔ پاک نیوز ایجنسی سٹیشنرز اینڈ بک سیلرز تربت مکران

۴۶۔ سردار محمد اشرف خاں صاحب۔ آزاد کشمیر کلاتھ اینڈ جنرل سٹور بالمقابل ہائی سکول غازی